لا الٰہ الا اللہ

محمد شفیق فاروقی

مصنف:	محمد شفیق فاروقی
ریسرچ کوارڈینیٹر:	عمر فاروق فاروقی، انوار قمر
تکنیکی معاونت:	عظمیٰ نذیر
مارکیٹنگ:	عمر فاروق فاروقی 6836 503 300 92+، عامر عقیل فاروقی 9389 429 300 92+
ڈیزائننگ:	عامر علی
	عظمیٰ نذیر
طابع:	ٹوپیکل پرنٹنگ پریس، لاہور۔
طبع اوّل:	اکتوبر 2018ء
قیمت:	
ISBN:	978-969-712-013-0
پتہ:	فاروقی آرٹ سٹوڈیو/درویش گاہ، ایم-8، صدیق ٹریڈ سنٹر، مین گلبرگ، لاہور۔
فون نمبر:	+92 306 401 6514
ای میل:	sfarooqiart@yahoo.com
	farooqiart@gmail.com
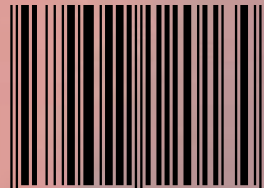
میری دعا

کوئی تو ہوگی جزا ایسے مُناجاتی کی
عمر بھر جس نے ترے اِسم کی خطاطی کی

اے اللہ تو بڑا اعظیم، شفیق، خوبصورت اور مہربان ہے۔ یہ لوح و قلم تیری جلوہ گری کے کرشمے ہیں۔ دنیا کے تمام علوم وفنون تیری ہی شان و عظمت کے لئے ہیں۔ تمام تعریفیں تیرے لئے اور سب کام تیرے لئے۔ تمام بھروسے تجھ ہی سے منسوب ہیں۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ ناچیز کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ میری التجاہ ہے کہ مجھے ہمت، استطاعت، استقامت اور وسائل عطا فرما کہ میں تیرے لئے اتنا کام کروں کہ جس سمت نظر جائے اطراف کے در و دیوار تیرے ہی نام سے مزین و مرطع نظر آئیں۔ جس گھر کا دروازہ کھولوں سامنے تیرا ہی نام آویزاں نظر آئے۔ اس پاک سرزمین پر ایک عظیم والشان عمارت میں تیرے ناموں کو اس طرح مزین کروں کہ دنیا بھر میں بے مثال نمونہ بنے اور اس کا کوئی ثانی نہ ہو۔ میرے اللہ تو سب کا پروردگار ہے میرا تیرے سوا کوئی پرسان حال نہیں۔ مجھ سمیت تمام امت مسلمہ پر اپنا خصوصی فضل و کرم فرما۔ آمین

محمد شفیق فاروقی

ت کا اپنی مجھے

س ترے تازلع

فِروزاں ہیں

مجھے اِتنی کہ چہر

مظفر وارثی

شفیق فاروقی کی خطاطی کی کتاب کے اجراء کے موقع پر

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

جناب ڈاکٹر عارف علوی کا پیغام

خوشی کی بات ہے کہ ملک کے معروف خطاط شفیق فاروقی تقریباً 150 روغنی رنگوں کی خطاطی پر مشتمل کتابیں شائع کررہے ہیں، جس میں انہوں نے اللہ کریم اور اس کے رسول پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء گرامی کو اپنی مصوری کا مرکز ومحور بنایا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے نامور مصوروں نے مصورانہ خطاطی کی روایت کو ایک نئی جہت عطا کی تھی، جن میں شاکر علی، عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین، گل جی، محمد حنیف رامے اور اسلم کمال خاص طور پر اس دبستان خطاطی میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ شفیق فاروقی نے اپنے تحقیقی سفر میں اس ثروت مندانہ سے استفادہ بھی کیا ہے اور ایک انفرادی راہ بھی نکالی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے کام کو محنت اور لگن کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

یقین ہے کہ پیش نظر کتب جہان فن میں لائق تحسین گردانی جائیں گی اور عوام بھی اس سے مستفید ہوں گے۔

مئی 2019ء

پیش لفظ

جس طرح پھول ہر شاخ پہ دعا کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی مانند مہکتا ہے اسی طرح سُر محبت کا پیغام دیتے ہیں جہاں خوشبو اور سُر آپس میں مل جائیں وہاں سے مصوری شروع ہو جاتی ہے، جو بھی خاکہ تیار کیا جاتا ہے اسے مصور اپنے سوچ کے رنگ دینے کے لئے دھنک سے التجا کرتا ہے اور اس کے سامنے ہاتھ باندھے تابعداری کا استعارہ بن جاتا ہے، رنگوں کی بھی اپنی حاکمیت ہوتی ہے ایسے میں وہ روشنی کی کرنوں سے منور رنگوں کو مصور اور خطاط کے جام جنوں میں تاثیر، رنگ اور روشنی انڈیل دیتے ہیں۔ جس طرح محبوب اور محبّ کے وصل سے محبت کی نخل سیراب ہوتی ہے اسی طرح سے مصور کے شوقِ جنون سے خطاطی اور تصور گفتگو کر اُٹھتے ہیں۔

میں نے مصوری کے دوران اپنے وجود کی نفی ہوتے دیکھی اور میرے اندر ایک وجدان کی کیفیت نے جنم لیا میری روح اکثر میرے رنگوں میں پرواز کرنے لگتی، میں اپنی انگلیوں اور رنگوں سے لکیریں بناتا تو مجھے ان میں آیتوں کی شبیہ نظر آتی۔ کئی مرتبہ تو آڑھی ترچھی لکیروں میں اس طرح محو ہو جاتا کہ اپنے ہونے کا احساس خود کو دلانے کے لئے مجھے خود کو چٹکی کاٹنی پڑتی، پہروں ڈوبتے سورج کو دیکھنا، چاند سے باتیں کرنا، ستارے گننا، تیز ہواؤں میں دریچہ کھول دینا اور موسیقی کے لئے کینوس پہ برش چلانا بس یہی میری کیفیات تھیں، مین کیفیت کا مصور بھی ہوں اور جذبات کا ذہنی بھی، مجھے کچھ انوکھا کرنے کی لگن تڑپاتی رہی، حاصل یہ ہوا کہ بطور مصور میں نے مصوری کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری پینٹنگز کو نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک خصوصاً امریکہ، برطانیہ، ترکی اور دیگر ممالک میں سراہا گیا۔ اسلامی خطاطی ہمیشہ میری ترجیح رہی ہے۔ شروع میں کینوس پر برش کی مدد سے تخلیق سفر کا آغاز کیا لیکن اس امر کا علم ہونے پر کہ برش کے ریشے اسلامی نقطہ نظر سے کچھ مناسب مواد سے تیار نہیں کیے جاتے ہیں میں نے اسلامی خطاطی، قرآنی آیات خصوصاً اسمائے حسنہ کی پینٹنگز تخلیق کرتے وقت برش کے استعمال سے دانستہ احتراز کیا۔ میں کینوس پر روغنی رنگوں سے خطاطی کو تصور کرتے ہوئے قلم یا برش کی بجائے پلٹ نائف اور اپنے ہاتھوں کی تخلیق انگلیاں استعمال کرتا ہوں تاکہ مقدس اور بابرکت ناموں کی پینٹنگز میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے، اگرچہ اس طرح بعض اوقات میری مصورانہ خطاطی کے دائروں اور قوسوں کے اوزان میں قدرے فرق آجاتا ہے تاہم مجھے فخر ہے کہ ان پینٹنگز میں رنگ میری انگلیوں کی پوروں میں پھوٹے ہیں اور ان کی صورت گری میری وجدانی کیفیت کی مجاز ہے۔

اسلامی ماحول اور فنون لطیفہ مجھے خاندانی وراثت میں ملے ہیں۔ ابتدائی تعلیم میں مجھے ایسے استاد ملے جنہوں نے میری بہت راہنمائی کی۔ 1965 میں لاہور منتقل ہوا تو میرے تایا منشی محمد حسین خطاط اور ماموں محمد اشرف آرٹسٹ کی مدد سے استاد لطیف اور استاد اللہ بخش کی صحبت نصیب ہوئی جنکی راہنمائی سے میں نے اپنی مصوری کا آغاز لینڈ سکیپ سے شروع کیا میری پہلی نمائش

الحمرا آرٹ کونسل میں ہوئی جس کا افتتاح استاد اللہ بخش نے کیا۔ اس نمائش میں، میں نے لینڈ سکیپ کا انتخاب کیا میری اس نمائش میں آبی رنگوں کی مصوری اور روغنی رنگوں کی مصوری کو بہت پسند کیا گیا۔ استاد اللہ بخش نے مجھے ایک پینٹنگ پر اسپیشل انعام بھی دیا بعد میں مجھے استاد خالد اقبال اور اپنا مولکا احمد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ دور میری زندگی کا بہت اہم دور ہے۔ اس زمانے میں روائتی خطاطی پر بہت کام ہو رہا تھا کچھ سینئر مصوروں نے خطاطی کو اپنے اپنے انداز میں پیش کرنا شروع کیا جس کو مصورانہ خطاطی یا خطی مصوری کا نام دیا گیا۔ استاد شاکر علی نے اپنی مصوری میں خطاطی کو بطور موضوع پینٹ کیا۔ یہ ایک نیا انداز تھا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری مصوری کا دوسرا مرحلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ میری خطی مصوری اپنے اچھوتے انداز کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔

پاکستان میں تمام بڑے شہروں کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک خطاطی اور مصوری کی نمائشیں کیں اس کے علاوہ مقامی طور پر مختلف ہسپتالوں اور اداروں خاص طور قابل ذکر شیخ زید ہسپتال اور فاطمہ میموریل ہسپتال میں جو خطاطی کا کام کیا وہ قابل تعریف ہے۔ میری مصوری کا تیسرا دور Symbolic Paintings تب شروع ہوا جب مجھے فاؤنٹین ہاوس لاہور اور ذہنی امراض کے ایک ادارے کے ساتھ ترکی اور ہالینڈ میں کام کرنے کا موقع ملا اور یہی میری ماسٹر ڈگری کا مقالہ تھا۔

Symbiosis Concept in Art, Journey of Lines with Symbols, Calligraphy and Color جس کی مدد سے افکار اقبال پر کام شروع کیا تو خیال آیا کہ پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے نبی ﷺ کے مبارک ناموں پر تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے چنانچہ "لا الہ اللہ" اور "محمد الرسول اللہ ﷺ" کے عنوان سے دو کتابیں ترتیب دیں، خطاطی کے ان نمونوں کو کتابوں کی صورت میں یکجا اور شائع کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ فیض و برکات کے حامل ان نمونوں تک عوام و خواص کی رسائی ہو اور اس کی تاثیر سے زیادہ لوگ فیض یاب ہو سکیں۔

شکر الحمد اللہ پہلی کتاب "لا الہ الا اللہ" جو کہ اللہ کے ناموں پر مشتمل ہے پیش کی جا رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کتاب سب کو بہت پسند آئے گی۔ میں اپنے ان تمام احباب اور عزیز و اقارب کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری و اشاعت میں میری مدد کی ان سب کے لئے دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے اللہ پاک سے دعا گو ہوں۔۔

دعا گو و دعا جو

محمد شفیق فاروقی

طائرانہ نظر

خطاطی (Calligraphy) اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے موجودہ دور میں داخل ہوگئی۔ زمانہ قدیم سے لوگ اُس وقت کے مروجہ ثقافتی انداز سے خطاطی میں جدت لاتے رہے۔ صدیوں سے جاری اس فن کو خلافت راشدہ کے دور میں ایک نئی جہت ملی۔ الفاظ قرآنی اور آیات قرآنی کا انگ ،منظر عام پر آیا جس سے خطاطی کا طرز و اسلوب بدل گیا۔ پھر مختلف رسم الخط وجود میں آئے۔ اس طرح ہر خطاط نے اپنی کاوش کو اپنے تجربے اور بساط کے مطابق منفرد انداز میں پیش کیا اور نئی اختراع کے ساتھ پرانی روایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ اس طرح خطاطی کو دوام اور جدت ملی۔

قدیمی، موجودہ دور میں محمد حنیف رامے، صادقین، گُلجی کے نام نمایاں ہیں۔ محمد شفیق فاروقی کا نام بھی اس فہرست میں آتا ہے۔ انہوں نے خطاطی کو ایک نئی جہت اور جلا بخشی ہے۔ شفیق فاروقی نے روغنی رنگوں سے مصوری میں خطاطی (Painting with Calligraphy in Oil Colours) کو روشناس کروایا ہے۔ زیر نظر ان کی دونوں کتابیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انہوں نے رب العالمین کے صفاتی نوموں کے " لا الا الا اللہ" اور رحمت العالمین کے صفاتی ناموں کو "محمد رسول اللہ" کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے شفیق فاروقی کا اللہ سے لگاؤ اور عشق نبی ﷺ ظاہر ہوتا ہے۔ زیر نظر دونوں کتابیں نئی نسل کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گی اور عاشقوں کے لئے رنگوں کی آمیزش کا منفرد انداز اپنی مثال آپ ہے۔ یہ شفیق فاروقی کا خاصہ ہے کہ رنگوں کو اس انداز میں ملاتے ہیں کہ رنگ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والے انگشت بداں رہ جاتے ہیں۔ مزید براں کہ رنگ خود ہی الہامی اسماء کے مفہوم اور مطالب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جو شفیق فاروقی کی روحانی اور وجدانی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے فن میں بیک وقت تین جہتیں نظر آتی ہیں یعنی مصوری، خطاطی اور تفسیر۔ یہی روغنی رنگوں سے مصورانہ تفسیری خطاطی ان کی جہد وجہد اور سعی مسلسل ہے۔ بقول علامہ اقبال

زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

میری والدہ محترمہ سیدہ وحیدہ کے شفیق فاروقی کے ساتھ بہت اچھے مراسم تھے۔ میری والدہ خطاطی کو پروان چڑھتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں اور ان فن پاروں کو اعلیٰ درجہ پر تصور کرتی تھیں۔ اس زمانے کے بطور عطیہ چند خطاطی کے یادگار فن پارے فاطمہ میموریل ہسپتال کی اب بھی زینت ہیں۔

مجھے امید واثق ہے کہ شفیق فاروقی ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد اپنے وعدے کے مطابق افکار اقبال پر ضرور کام کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو استقامت، حوصلہ اور ہمت دے۔ آمین

خیر اندیش

جسٹس (ر) ناصرہ اقبال

لاہور۔

اتوار۔ 16 جون 2019

شفیق فاروقی۔ خطاطی اور فقر کا آرٹسٹ

جب بھی خطاطی، مصوری اور فقر وغنا کا تذکرہ کریں تو جو نام سب سے پہلے آتا ہے، وہ جناب شفیق فاروقی صاحب ہیں۔ خواجہ حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے کہ "جب میں دنیا اور روزگار دنیا سے کٹ جاتا ہوں تو میرے اندر کا انسان بیدار ہوتا ہے اور پھر میں وہ کہتا ہوں جو مجھے کہنا ہوتا ہے" ۔اسی طرح نظامی گنجوی سے اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا کہ حق شناسی کا مفہوم تب آشکار ہوتا ہے جب دو عالم سے بیگانہ ہو جاتا ہوں۔ اسی کلام کا ترجمہ اقبال نے اس طرح کیا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو

عجب چیز ہے لذت آشنائی

شفیق فاروقی کا کام ایک طویل عرصہ سے دیکھتا آرہا ہوں ۔ ماشاء اللہ خوب سے خوب تر کا سفر جاری ہے۔ صادقین، رامے، گُل جی اور شاکر علی کے ساتھ ساتھ شفیق فاروقی کا نام بھی شامل ہے اور خطی مصوری میں اُن کا یہ کام بھی جدت وندرت کا شاہکار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُنکے فن پارے ذکر الٰہی میں مصروف ہیں۔ فاروقی صاحب نے ہمیشہ شرعی حدود کی پاسداری کی ہے۔ اِس اعتبار سے وہ اسی دولت لازول کے امین ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کاغذ سے بہت پہلے کی ایجاد "رق" اور مہرق یعنی کینوس پر رنگوں کی دینا میں خطاطی کو روشناس نہ کرایا جاتا تو یہ فن صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا۔

شفیق فاروقی نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں جانے پہچانے جاتے ہیں اُنہوں نے نہ صرف بہت سے ممالک کا دورہ کیا بلکہ وہاں پر اپنے فن کا لوہا بھی منوایا۔ اُنہوں نے ترکی میں بھی بہت سال گزارے ہیں۔ وہ تعریف وستائش سے بیگانہ ہوکر اپنی تخلیقات کو رجائے الٰہی کے سپرد کرتے ہیں۔

شفیق فاروقی نہ صرف اس عہد میں ہیں بلکہ خود ایک عہد ہیں ۔ اور غالباً اس سفرِ رنگ وحرف میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ آنے والی نسلوں کی اِسی طرح راہنمائی فرماتے رہیں گے۔

مخلص

خورشید عالم گوہر

مورخہ 18-10-2018

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک شاعر نے کہا   رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے

یہ مصرع مصور شفیق فاروقی کی خطاطی پر صادق آتا ہے، واقعی کینوس پر بکھرے ہوئے ان کے رنگ باذوق لوگوں سے باتیں کرتے ہیں۔ کیا باتیں کرتے ہیں اور ان سے کیا سمجھ آتی ہے، یہ ہر ایک کے ذوق پر منحصر ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان فن پاروں میں خوبصورتی ہے اور خوبصورتی میں خوشبو محسوس ہوتی ہے، خاص طور پر اِن کتب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے اسمائے حسنہ کی جو مصوری طبع ہوئی ہے وہ دل و دماغ اور روح کو منور کرتی ہیں۔

شفیق فاروقی صاحب بہت نامور مصور ہیں دینا کے مختلف ممالک میں ان کے فن پاروں کی نمائشیں منعقد ہو کر پزیرائی حاصل کر چکی ہیں خاص طور پر ترکی میں تو انہیں بے حد پسند کیا جاتا ہے اور یہ بھی مولانا روم کے ملک میں جا کر بے حد خوشی محسوس کرتے ہیں کہ وہاں سے انہیں روحانی فیض بھی حاصل ہوتا ہے۔

شفیق فاروقی صاحب نے زیرِ نظر دو کتابوں "لا الہ الا اللہ" اور "محمد الرسول اللہ" میں اسمائے حسنہ کی بہت خوبصورت مصوری کی ہے۔ میں اس خوبصورت کام پر فاروقی صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اپنے فن کے ذریعے دین کی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ آمین

جمال شاہ (ڈائریکٹر جنرل)

پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس، اسلام آباد

****

جناب شفیق فاروقی صاحب کی پینٹنگز دیکھیں پہلی نظر میں ایک عجیب قسم کا سکون میسر آیا۔ نوجوانوں کی بے راہ روی کے اس دور میں شفیق فاروقی صاحب کی مذہبی وابستگی قابل تحسین ہے۔ ان کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی پینٹنگز پہلی نظر میں ہی منتشر ذھنوں کو اس طرح جکڑ لیتی ہیں کہ ان کی گرفت سے بچ نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی پینٹنگز خوبصورت رنگوں کا امتزاج اور سطحی دلکشی کے علاوہ گہرائی کی حامل بھی ہیں جو روحانی تسکین کا باعث بنتی ہیں۔

عاطف رئیس خان

چیئرمین ایل۔ ایم۔ کے۔ ٹی۔ اسلام آباد

محمد شفیق فاروقی، ایک سچے عاشقِ رسولؐ

محترم محمد شفیق فاروقی کا شمار ملک کے نام ور اور مایہ ناز خطاطوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس میدان میں یادگار نقش تخلیق کئے ہیں جس کی تازہ مثال اُن کی (بڑے سائز کی) دو کتابوں سے سامنے آتی ہے۔ ایک کتاب لا الہ الا اللہ کے نام سے حمدِ باری تعالی اور دوسری کتاب محمد الرسول اللہ کے نام سے سیرت رسول پاکؐ پر ہے اور یہ دونوں نام مل کر کلمہ طیبہ بنتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں رب ذوالجلال اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمتوں پر کی گئی عمدہ خطاطی (کیلی گرافی) کا نمونہ ہیں۔

محمد شفیق فاروقی ایک سچے مسلمان اور عاشقِ رسولؐ ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کتابوں کے ذریعے نئی نسل کو صداقت عشق کا ایک بڑا پیغام دیا ہے اور خطاطی کے طلبہ کے لئے ایک عمدہ ذخیرہ چھوڑا ہے۔ میں انہیں اس خوبصورت کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اسلام آباد

****

مصوری اور خطاطی کے حوالے سے جناب شفیق فاروقی کی شہرت تو بہت سنی تھی اور اُن کے مصوری کے فن پاروں کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جن میں انہوں نے مولانا رومؒ کے تصورِ عشق میں مگن لوگوں کی سرشاری کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن زیرِ نظر کتابوں "لا الہ الا اللہ" اور "محمد الرسول اللہ" میں جو خطاطی طبع ہوئی ہیں وہ نہ صرف فنی لحاظ سے بہت اعلیٰ پائے کی ہیں بلکہ انہیں دیکھ کر نظر کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کو بھی سکون محسوس ہوتا ہے۔ سرورق سے آخری صفحہ تک آپ صفحات پلٹتے جائیں، خوبصورت رنگوں سے مزین اسمائے حسنہ دل و دماغ کو عقیدت کی کیفیت سے سرشار کرتے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کے ناموں میں جو کوئی، معانی اور خصوصیات پنہاں ہیں، شفیق فاروقی صاحب نے اپنے موقلم سے انہیں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔

خطاطی کے ساتھ ان کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا بھی جامع انداز سے ذکر موجود ہے جبکہ ہر نام کے معنی اور اس کے مفہوم کے حوالے سے بھی کہیں اجمالی اور کہیں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یوں یہ کتابیں محض مصوری کا شہکار ہی نہیں بلکہ دین اسلام کی تبلیغ کا بھی ایک ذریعہ بن گئی ہیں جو بہر صورت ایک مستحسن اور مثبت اقدام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فاروقی صاحب کو اس نیک مقصد کا اجر عطا فرمائے۔ آمین

مخلص: قاضی جاوید

ڈائریکٹر انسٹیٹوٹ آف اسلامک کلچر، لاہور

نگارشات

حکیم محمد سعید (ہمدرد کراچی۔ ۱۷ جون ۱۹۷۹)

شفیق فاروقی صاحب! آپ کی خطاطی کے نمونے دیکھ کر میری روح، یادیں اور ایمان تازہ ہوگیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کے نیک کام میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین

شمیم اختر (ایڈیٹر، اخبار خواتین کراچی۔ ۲۸ جون ۱۹۷۹)

خطاطی کے یہ نمونے ایسے ہیں جو گھر میں رنگ ہی نہیں پاکیزگی بھی پیدا کرتے ہیں۔ گھر کے ماحول کو پاکیزگی کا رنگ دینے کے لئے خطاطی کے ان نمونوں میں سے ایک ہر گھر کی ضرورت ہے۔ مناظر کے نمونے بھی خوش رنگ ہیں۔ ہمارے ہاں مصوری کے میدان میں منظر کشی کی کمی کو محسوس کیا جاتا ہے۔ مصور اس کمی کو کامیابی کے ساتھ پورا کرسکتا ہے۔

شریف کمال عثمانی (اسٹاف رپوٹر، روزنامہ حریت، کراچی۔ ۹-۱۹۷-۰۷-۰۲)

بہت اچھی پینٹنگز بنائیں ہیں۔ فن مصوری کو نئی راہ عطا کی ہے۔ خدا کرے دوسرے مصور بھی اس سے استفادہ کریں اور یہ فن فروغ پائے۔

حمیرا اطہر (اخبار خواتین، کراچی۔ ۳ جولائی ۱۹۷۹)

شفیق فاروقی کی ہر پینٹنگ دوسری سے قدرے مختلف نظر آتی ہے وہ ہر پینٹنگ پر ایک نیا تجربہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تیز رنگ اور نمایاں حروف ان کے اسلوب خطاطی کی انفرادیت ہیں انہوں نے اکثر جگہ فنی مہارت سے کام لیتے ہوئے ایک ہی رنگ میں لفظوں کو ابھارا ہے جس رنگ میں خطاطی کی ہے۔ اِسی رنگ کے ہلکے یا گہرے شیڈ میں پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے متضاد رنگوں کے استعمال سے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ ان کی مصوری میں الفاظ ابھر کر خود اپنا مفہوم بیان کرتے ہیں یہ تصویری خطاطی اور مصوری کا ایک حسین امتزاج ہے

انور سجاد (لاہور۔ ۷ جون ۱۹۸۰)

اللہ تعالیٰ اب آپ کو اس جذب کی حالت سے نکال کر پھر دنیا میں لا کھڑا کرے اور تحیئر کی وہی کیفیت طاری رہے جو اس اسم میں ہے۔

انتظار حسین (روزنامہ مشرق، لاہور۔ ۷ جون ۱۹۸۰)

شفیق فاروقی کے بنائے ہوئے لفظ دیکھے اور خوش ہوا۔

سعادت خیالی (سینئر رپوٹر، روزنامہ مشرق، لاہور۔ ۷ جون ۱۹۸۰)

میں بطور مہمان نمائش دیکھ کر ورطہ حیرت میں گم ہوگیا کہ ایسی پاکیزہ اسلامی مصوری نے دل کو سرور دیا ہے اور حق اور حقیقت بنا دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ابصار عبدالعلی (۴۳-سی، جی-او-آر-۱۱۱، لاہور۔ ۱۹۸۱-۰۷-۰۳)

یہ نامکمل تاثر ہے کہ شفیق فاروقی کی تصویری خطاطی کی نمائش ہے۔ تاثر کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ شفیق فاروقی کی تفسیری خطاطی کے ارتقاء کی نمائش ہے۔ شفیق فاروقی بڑی تیزی سے اپنے جاندار اسلوب کے حصار میں آتے جا رہے ہیں۔ یہی ان کے فن کی نمائش ہے۔ انہوں نے خطاطی کو فن سے آگے لے جا کر فن لطیف کا درجہ دلوا دیا ہے۔ ان کے رنگوں میں روح آ گئی ہے۔ لفظ کلام کرتے ہیں۔

اسلم کمال (۵۶۸ جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ ۱۹۸۱-۰۷-۰۵)

اللہ تعالیٰ بندوں کو اظہار کی کتنی صلاحیت دیتا ہے اس بات کا اظہار یہ تخلیقات ہیں۔ شفیق فاروقی کے فن کا مستقل ناظر ہوں۔ ان کو ہر نمائش میں مسلسل آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ میں ان کی مزید کامیابی کا متمنی ہوں۔

ظہورعالم شہید (۳-اے، کوپر روڈ، لاہور ۔۱۹۸۱-۰۷-۰۵)

شفیق فاروقی کی مصورانہ خطاطی بڑی کامیاب اور موثر ہے۔ خدا انہیں مزید کامیابیوں سے سرفراز کرے۔

فیض احمد (لاہور ۔۱۹۸۲-۰۱-۰۳)

اتنی اعلیٰ وارفع خیالات واحساسات کی آئینہ یہ تصاویر جو حسنِ عقیدت کا برملا اظہار کر رہی ہیں۔ یقیناً ایک عظیم فنکار کی فنکارانہ عظمت کی دلیل ہیں۔

بیگم فرحت شجاع الرحمٰن (میئر لاہور؛ کاشانہ قادر، ۵۰ جی-ٹی-روڈ، لاہور ۔۱۹۸۲-۰۱-۱۲)

فاروقی صاحب کی فنی تخلیقات دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی۔ انہوں نے رنگوں کو وجدانی جذبوں کے ساتھ کاغذ پر بکھیرا ہے۔ اللہ ازواجل کی صفات کا عکس ہر رنگ میں الگ الگ نمایاں ہے۔ اللہ تعالیٰ ترقی دے۔ آمین۔

یاور مہدی (ریڈیو پاکستان، کراچی ۔۱۹۸۲-۰۴-۱۳)

میں شفیق فاروقی کے فن پاروں سے بیحد متاثر ہوا ہوں۔ فاروقی صاحب اس عہد کے ایک اچھے فنکار ہیں اور اُن سے ہمیں کافی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

انور انصاری (۹۲۷-کے، کورنگی، کراچی ۔۱۹۸۲-۰۴-۱۵)

شفیق فاروقی صاحب نے لفظوں اور رنگوں میں جو ایک خاص قسم کا رشتہ برقرار کیا ہے وہ ان کی انفرادیت ہے۔ پس منظر اور پیش منظر کو باہم منظّم کر کے آپ کی خطاطی میں جو معنی اجاگر ہوتے ہیں وہ بڑے متاثر کن ہیں۔ لفظوں کی تراش خراش اور رنگوں کے بہاؤ سے جہاں آبشاروں کی مدھر آواز محسوس ہوتی ہے وہیں دیکھنے والا اس منظر میں گم صم ہو جاتا ہے اور اس پر سحر طاری ہو جاتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد (کراچی ۔۱۹۸۲-۰۴-۱۵)

یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں متعدد نمائشیں میں نے دیکھیں ہیں لیکن اس نمائش میں مجھے ایک نئی بات نظر آئی ہے۔ موضوع کہ تصویروں پر نہ مسلط کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی موضوع اور رنگوں میں پیوندکاری کی گئی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رنگوں کی آمیزش سے الفاظ کی تخلیق ہو رہی ہو۔

میرے نزدیک فن کا یہ ایک اچھوتا نمونہ ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ نمائش برصغیر کے مختلف حصوں میں دکھائی جائے۔ یہ نمائش مصوری کی نمائشوں میں ایک نئے دور کا اضافہ کر رہی ہے۔ میں شفیق فاروقی صاحب کو اس تخلیقی فن پر مبارکباد دیتا ہوں۔

رئیس امروہی (کراچی ۔۱۹۸۲-۰۴-۱۵)

آج عزیز دوست جناب جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جناب شفیق فاروقی کے تصور تخیلات وتصورات کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ انہوں نے صفات الٰہی کی تجلیات کو نقوش، خطوط، قوسین اور رنگ کی شکل میں تصور کیا ہے۔ اک جذبہ بے اختیارِ شوق ہے جو ان پینٹنگز سے نمایاں ہیں۔ الوہی استخارات، تخیل انگیز پس منظر اور بیش منظر۔ حقیقت یہ ہے کہ الہامی خطاطی کی اک نئی قسم ہے جسے شفیق فاروقی نے متعارف کرایا ہے۔ ذہن پر عجب اثر پڑا۔

مہتاب امر (اعظم منزل، ناظم آباد نمبر ا، کراچی ۔۱۹۸۲-۰۴-۱۸)

شفیق صاحب کی پینٹنگز دیکھنے کے بعد خوشی کا احساس پیدا ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے رنگوں اور قرآنی الفاظ کو خوبصورتی سے کینوس پر منتقل کیا ہے۔ رنگوں اور قرآنی الفاظ میں جو ردھم ہے وہ صرف شفیق صاحب کی پینٹنگز دیکھنے سے ملتا ہے۔

نورالحسن جعفری (۱۹۸۲-۰۴-۲۰)

رنگوں کے امتزاج میں اللہ تعالیٰ کے قدرت کی جھلک دیکھی۔

آذر زوبی (۱۹۸۲-۰۴-۲۱)

محبت وخلوص کے پیکر ! محنت وجد وجہد کے قائل !! ظاہر ہے کامیابی اور کامرانی آپ کا مقدر ہے۔ دعاؤں کے ساتھ

قدوس مرزا (این-سی-اے، لاہور۔۱۹۸۵-۰۳-۲۴)

بہت افضل نمائش ہے۔

بیگم سعیدہ وحید (فاطمہ میموریل ہسپتال، لاہور۔۱۹۸۲-۰۱-۰۴)

فاروقی صاحب کی Calligraphy دیکھ کر صحیح معنوں میں مسرت ہوئی۔ انکا آرٹ قابل ستائش ہے۔

بیگم سلمٰی تصدق حسین

کلام الٰہی اور رازہائے آفرینش کا اظہار رنگوں میں پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے جسے عزیز شفیق فاروقی نے کمال چابک دستی سے کینوس پر نقش کیا ہے۔ آپ نے قرآن پاک کی آیات کے معنی کو اپنے حسین تصورات سے اور بھی زیادہ حسین بنا دیا ہے۔ یہ نادر نمونے ایک قیمتی اثاثہ ہیں اور مصور کی کوشش نہایت قابل ستائش ہے

انور سدید

شفیق فاروقی صاحب کی نمائش جنت نظارہ ہے۔ انہوں نے لفظ کے معنی کو اس کے بطون سے ابھارا ہے اور اس کے مفہوم کو رنگوں کی جوالا میں متحرک کر دیا ہے۔ تخلیق عمل کی یہ معراج ان کی ہر تصویر میں موجود ہے۔

محمود الحسن رومی

آرٹسٹ برادری میں شفیق فاروقی بہت زیادہ کام کرنے والے ہیں۔

تاج سعید (پشاور، ۶ مارچ ۱۹۸۱)

فاروقی کا پینٹ کرنے کا جداگانہ انداز دلوں میں اتر جانے والا ہے۔ ان کو صرف پینٹ کرنے اور ان کی اشکال کو نئی معنویت دیتے ہیں جو کمال حاصل ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کی پینٹنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حروف خود ہم سے ہم کلام ہیں۔

لطیف کاشمیری (مری)

شفیق فاروقی ایک کہنہ مشق مصور اور خطاط ہیں جو رنگوں کے استعمال پر قدرت رکھتے ہیں اور اپنے موضوعات کو رنگوں کے قالب میں ڈھالنے میں بڑی مہارت رکھتے یں۔ ان کی محنت اور فنکارانہ لگن سادگی اور بے ریائی نے ان کی شخصیت میں خلوص و محبت کا ایک سمندر موجزن کر دیا ہے۔

اشفاق احمد (تلقین شاہ)

شفیق کی تصاویر میں رنگ اس طرح ملتے ہیں جیسے مدد سے بچھڑے ہوئے دو دوست آپس میں ملتے ہیں۔

حوالہ جات

.1 نام کتاب: قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں مصنف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

.2 نام کتاب: الاسماء الحسنیٰ مصنف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

خودی کا سِرِّ نہاں لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ فَساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کیا ہے تُو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سُود و زیاں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بُتانِ وہم و گُماں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

خِرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حُکمِ اذاں، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

پروردگار بحروبر

پروردگار بحر و بر
اے مالک جن و بشر
تابع تیرے شمس و قمر
ہر شئے تیرے زیر اثر
پروردگار بحر و بر
پروردگار بحر و بر
معبود توہی بلیقیں
تیرے سوا کوئی نہیں
کیا آسماں اور کیا زمین
خم ہے جہاں سب کی جبیں
بس ایک تیرا آستاں
بس ایک تیرا سنگ در
پروردگار بحر و بر
پروردگار بحر و بر
وہ طائران خوشنوا
وہ لہلہاتے سبزازار
وہ ذرا ے نہ چیز ہو
یا کوہساروں کی قطار
تسبیح ہی کرتے ہیں تیری
سب بے حساب و بے شمار
غافل ہیں ہم انساں مگر
پروردگار بحر و بر

پروردگار بحر و بر
تو واحد و بر حق بھی ہے
تو قادر مطلق بھی ہے
یارب بحق مصطفی
تو بخش دے اپنی خطا
اس ملت مظلوم کو
اس امت مرحوم کو
دے زندگی کر زندہ تر
پروردگار بحر و بر
پروردگار بحر و بر
ہیں وقت کے خار و میں ہم
آفات کے غاروں میں ہم
لگتی ہیں اپنی بولیاں
رسوا ہیں بازاروں میں ہم
بے شک سر فہرست ہیں
تیرے گنہگاروں میں ہم
پھر بھی ہے یہ قرآن میں
یعنی تیرے فرمان میں
لا یقنطو لا یقنطو
ستار تو غفار تو
پہچان ہے رحمت تیری
ہے شان تیری درگزر

الٰہ

لغوی تحقیق:

اس لفظ کا مادہ اَل ہَ ہے۔ اس مادہ سے جو الفاظ لغت میں آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

اَلِہَ اِذَا تَحَیَّرَ. حیران و سرگشتہ ہوا۔

اَلِھۡتُ اِلٰی فُلَانٍ اَیۡ سَکَنۡتُ اِلَیۡہِ. اس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون و اطمینان حاصل کیا۔

اَلِہَ الرَّجُلُ یَاۡلَہُ اِذَا فَزِعَ مِنۡ اَمۡرٍ نَزَلَ بِہٖ فَاَلَھَہٗ غَیۡرُہٗ اَیۡ اَجَارَہٗ. آدمی کسی مصیبت یا تکلیف کے نزول سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اس کو پناہ دی۔

اَلِہَ الرَّجُلُ اِلَی الرَّجُلِ اِتَّجَہَ اِلَیۡہِ لِشِدَّۃِ شَوۡقِہٖ اِلَیۡہِ. آدمی نے دوسرے کی طرف شدتِ شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

اَلِہ الۡفَصِیۡلُ اِذَا وَلِہَ بِاُمِّہٖ. اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہی اس سے چمٹ گیا۔

لَاہَ یَلِیۡہُ لِیۡھًا وَلَاھًا اِذَا احۡتَجَبَ. پوشیدہ مستور ہوا۔ نیز ارتفع یعنی بلند ہوا۔

اِلَہَ اِلٰھَۃً وَاُلُوۡھَۃً وَاُلُوۡھِیَّۃً عَبَدَ عبادت کی۔

ان تمام معانی مصدر یہ پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اَلِہَ یَاۡلَہُ اِلٰھَۃً کے معنی عبادت (پرستش) اور الٰہ کے معنی معبود کس مناسبت سے پیدا ہوئے:

۱۔ انسان کے ذہن میں عبادت کے لیے اوّلین تحریک اپنی حاجت مندی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کرسکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ اس کی حاجتیں پوری کرسکتا ہے، خطرات اور مصائب میں اسے پناہ دے سکتا ہے، اضطراب کی حالت میں سے سکون بخش سکتا ہے۔

۲۔ پھر یہ بات کہ آدمی کسی کو حاجت روا سمجھے اس تصور کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے سے بالاتر سمجھے اور نہ صرف مرتبہ کے اعتبار سے اس کی برتری تسلیم کرے، بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی اس کی بالادستی کا قائل ہو۔

۳۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلسلۂ اسباب و علل کے تحت جن چیزوں سے بالعموم انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں، اور جن کی حاجت روائی کا سارا عمل انسان کی آنکھوں کے سامنے یا اس کے حدودِ علم کے اندر واقع ہوتا ہے اس کے متعلق پرستش کا کوئی جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا مثلاً مجھے خرچ کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میں جا کر ایک شخص سے نوکری یا مزدوری کی درخواست کرتا ہوں، وہ میری درخواست کو قبول کر کے مجھے کوئی کام دیتا ہے اور اس کام کا معاوضہ مجھے دے دیتا ہے۔ یہ سارا عمل چونکہ میرے حواس اور علم کے دائرے کے اندر پیش آیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے میری یہ حاجت کس طرح پوری کی ہے، اس لیے میرے ذہن میں اس کے لائق پرستش ہونے کا وہم تک نہیں گزرتا۔ پرستش کا تصور میرے ذہن میں صرف اسی حالت میں پیدا ہوسکتا ہے جب کہ کسی کی شخصیت یا اس کی طاقت یا اس کی حاجت روائی و اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔ اسی لیے معبود کے معنی میں وہ لفظ اختیار کیا گیا جس کے اندر رفعت کے ساتھ پوشیدگی اور حیرانی و سرگشتگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔

۴۔ پھر جس کے متعلق بھی انسان یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ احتیاج کی حالت میں حاجت روائی کرسکتا ہے، خطرات میں پناہ دے سکتا ہے، اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے، اس کی طرف انسان کا اشتیاق کے ساتھ توجہ کرنا ایک امرِ ناگزیر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معبود کے لیے الٰہ کا لفظ جن تصورات کی بنا پر بولا گیا وہ یہ ہیں۔ حاجت روائی۔ پناہ دہندگی۔ سکون بخشی۔ بالاتری و بالادستی۔ ان اختیارات اور ان طاقتوں کا مالک ہونا جن کی وجہ سے یہ توقع کی جائے کہ معبود قاضی الحاجات اور پناہ دہندہ ہوسکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا پراسرار ہونا یا منظرِ عام پر نہ ہونا۔ انسان کا اس کی طرف مشتاق ہونا۔

اہل جاہلیت کا تصورِ الٰہ:

اس لغوی تحقیق کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اُلوہیت کے متعلق اہل عرب اور اُمم قدیمہ کے وہ کیا تصورات تھے جن کی تردید قرآن کرنا چاہتا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ (مریم)

اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں (یا ان کی حمایت میں آکر وہ محفوظ رہیں)

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ (یٰسٓ ۸۳)

اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنالیے ہیں اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائے گی (یعنی وہ الٰہ ان کی مدد کریں گے)

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت جن کو اللہ کہتے تھے ان کے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کے پشتیبان ہیں، مشکلات اور مصائب میں ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی حمایت میں وہ خوف اور نقصان سے محفوظ ہوجاتے ہیں۔

فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ (ھود)

جب تیرے رب کے فیصلہ کا وقت آگیا تو ان کے وہ الٰہ جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے اور وہ ان کے لیے تباہی و ہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (النحل ۲۰۔۲۲)

اور اللہ کے بجائے جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں، مردہ ہیں نہ کہ زندہ اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ انہیں کب دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ (قصص ۸۸)

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکارو اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ (یونس ۶۶)

جو لوگ اللہ کے بجائے دوسرے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ محض وہم پر چلتے ہیں اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

ان آیات سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اہل جاہلیت جن کو الٰہ کہتے تھے، انہیں مشکل کشائی و حاجت روائی کے لیے پکارتے یا بالفاظ دیگر ان سے

دعا مانگتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے، جیسا کہ اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۲۱﴾ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان الٰہوں کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ان کی دعاؤں کو سنتے ہیں اور ان کی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں۔

وَ لَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا مَا حَوۡلَكُمۡ مِّنَ الۡقُرٰی وَ صَرَّفۡنَا الۡاٰیٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوۡ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ قُرۡبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلۡ ضَلُّوۡا عَنۡهُمۡ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفۡكُهُمۡ وَ مَا كَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۸﴾ (احقاف ۲۷-۲۸)

تمہارے اردگرد جن بستیوں کے آثار ہیں ان کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ انہیں ہم نے بار بار بدل کر اپنی نشانیاں دکھائی تھیں تا کہ وہ رجوع کریں تو جن کو انہوں نے تقرّب کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے سوا اپنا الٰہ بنایا تھا۔ انہوں نے نزولِ عذاب کے وقت کیوں نہ ان کی مدد کی؟ مدد تو درکنار وہ تو انہیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ یہ تھی حقیقت ان کے جھوٹ اور ان کی من گھڑت باتوں کی۔

وَ مَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ یُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّیۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا یُنۡقِذُوۡنِ ﴿ۚ۲۳﴾ (یٰس ۲۲-۲۳)

کیوں نہ میں اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے؟ کیا اس کے سوا میں ان کو الٰہ بناؤں جن کا حال یہ ہے کہ اگر رحمن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش میرے کچھ کام نہیں آسکتی اور وہ مجھے چھڑا نہیں سکتے۔

وَالَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلۡفٰی ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡكُمُ بَیۡنَهُمۡ فِیۡ مَا هُمۡ فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ۬ؕ (الزمر ۳)

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے حامی و کارساز بنا رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں وہ اللہ سے قریب کردیں، اللہ ان کے درمیان اس معاملہ کا فیصلہ (قیامت کے روز) کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَ یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُهُمۡ وَ یَقُوۡلُوۡنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ (یونس ۱۸)

وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچانے پر قادر ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ان آیات سے چند مزید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں سے متعلق یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ ساری خدائی انہی کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے اور ان کے اوپر کوئی خداوند اعلیٰ نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر ایک خداوند اعلیٰ کا تصور رکھتے ہیں جس کے لیے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا، اور دوسرے الٰہوں کے متعلق ان کا اصل عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوند اعلیٰ کی خدائی میں ان الٰہوں کا کچھ دخل اور اثر ہے، ان کی بات مانی جاتی ہے، ان کے ذریعہ سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، ان کی سفارش سے ہم نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ انہی خیالات کی بنا پر وہ اللہ کے ساتھ ان کو بھی الٰہ قرار دیتے تھے۔ لہٰذا ان کی اصطلاح کے مطابق کسی کو خدا کے ہاں سفارشی قرار دے کر اس سے مدد کی التجا کرنا اور اس کے آگے مراسم تعظیم و تکریم بجالانا اور نذر و نیاز پیش کرنا اس کو الٰہ بنانا ہے۔

(۴) وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰهَیۡنِ اثۡنَیۡنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۵۱﴾ (النحل ۵۱)

اللہ فرماتا ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ، الٰہ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو۔

وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشۡرِكُوۡنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ شَیۡئًا ؕ (انعام ۸۰)

اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں ان سے ہرگز نہیں ڈرتا جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ الا یہ کہ میرا رب ہی کچھ چاہے تو وہ البتہ ہوسکتا ہے۔

اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىكَ بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ‌ؕ (ھود ۵۴)

ہود (علیہ السلام) کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ ہم تو کہتے ہیں کہ تجھ پر ہمارے الٰہوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں سے یہ خوف رکھتے تھے کہ اگر ہم نے ان کو کسی طرح ناراض کر دیا، یا ان کی توجہات وعنایات سے محروم ہو گئے تو ہم پر بیماری، قحط، نقصانِ جان ومال اور دوسری قسم کی آفات نازل ہو جائیں گی۔

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ‌ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا‌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ؕ (التوبہ ۳۱)

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا، اور مسیح ابن مریمؑ کو بھی رب ٹھہرایا، حالانکہ انہیں صرف ایک الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۙ (الفرقان ۴۳)

تیرا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ بنالیا ہے؟ کیا تو اس کی ذمہ داری لے سکتا ہے؟

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ شُرَكَآؤُهُمۡ (انعام ۱۳۷)

اس طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں (یعنی شرکاء فی الالوہیت) نے اپنی اولاد کو قتل کرنے کا فعل خوشنما بنا دیا۔

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ‌ؕ (شوریٰ ۲۱)

کیا وہ ایسے شرکاء (یعنی شرکاء فی الالوہیت) رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے از قسم دین ایسی شریعت مقرر کی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔

ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم ملتا ہے جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فوق الطبعی اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے جس کو الٰہ بنایا گیا ہے وہ یا تو کوئی انسان ہے یا انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور الٰہ اس کو اس معنی میں نہیں بنایا گیا ہے کہ اس سے دعا مانگی جاتی ہو یا اسے نفع ونقصان کا مالک سمجھا جاتا ہو، اور اس سے پناہ ڈھونڈی جاتی ہو۔ بلکہ وہ الٰہ اس معنی میں بنایا گیا ہے کہ اس کے حکم کو قانون تسلیم کیا گیا، اس کے امر ونہی کی اطاعت کی گئی، اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام مان لیا گیا، اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس کو بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے، کوئی اور اقتدار اس سے بالاتر نہیں ہے جس کی سند لینے اور جس سے رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔

پہلی آیت میں علماء اور راہبوں کو الٰہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کی واضح تشریح ہم کو حدیث میں ملتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے علماء اور راہبوں نے حلال کیا اسے تم لوگ حلال مان لیتے تھے، اور جسے حرام قرار دیا اسے تم حرام تسلیم کر لیتے تھے اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ اللہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔

رہی دوسری آیت تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہش نفس کی اطاعت کرتا ہو اور اسی کے حکم کو بالاتر رکھتا ہو وہ دراصل اپنے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کے بعد والی دونوں آیتوں میں اگرچہ الٰہ کے بجائے شریک کا لفظ آیا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں واضح کیا ہے، شریک سے مراد الٰہیت میں شریک ٹھہرانا ہے۔ اور یہ دونوں آیتیں صاف فیصلہ کرتی ہیں کہ جو لوگ اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے مقرر کیے ہوئے رواج یا ضابطہ یا طریقہ کو جائز قانون سمجھتے ہیں وہ اس قانون ساز کو الٰہیت میں خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

الُوہیّت کے باب میں ملاک اَمر

اللہ کے یہ جتنے مفہومات اوپر بیان ہوئے ہیں ان سب کے درمیان ایک منطقی ربط ہے۔ جو شخص فوق الطبعی معنی میں کسی کو اپنا حامی و مددگار، مشکل کشا اور حاجت روا، دعاؤں کو سننے والا اور نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے۔ اس کے ایسا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک وہ ہستی نظامِ کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار رکھتی ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی سے تقویٰ اور خوف کرتا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ اس کی ناراضی میرے لیے نقصان کی اور رضامندی میرے لیے فائدے کی

موجب ہے اس کے اس اعتقاد اور اس عمل کی وجہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے ذہن میں اس ہستی کے متعلق ایک طرح کے اقتدار کا تصور رکھتا ہے۔ پھر جو شخص خداوند اعلیٰ کے ماننے کے باوجود اس کے سوا دوسروں کی طرف اپنی حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے اس کے اس فعل کی علت بھی صرف یہی ہے کہ خداوندی کے اقتدار میں وہ ان کو کسی نہ کسی طرح کا حصہ دار سمجھ رہا ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس وہ شخص جو کسی کے حکم کو قانون اور کسی کے امر و نہی کو اپنے لیے واجب الاطاعت قرار دیتا ہے وہ بھی اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ پس الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے، خواہ وہ اقتدار اس معنی میں سمجھا جائے کہ نظام کائنات پر اس کی فرماں روائی فوق الطبعی نوعیت کی ہے، یا وہ اس معنی میں تسلیم کیا جائے کہ دنیوی زندگی میں انسان اس کے تحت امر ہے اور اس کا حکم بذاتِ خود واجب الاطاعت ہے۔

قرآن کا استدلال:

یہی مقتدر اعلیٰ کا تصور ہے جس کی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے۔ خلق اسی کی ہے، نعمت اسی کی ہے، امر اسی کا ہے، قوت اور زور بالکل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر چیز چارو ناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے، اس کے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے، نہ کسی کا حکم چلتا ہے، نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے اور نہ کوئی اختیاراتِ حکومت میں ذرہ برابر شریک و حصہ دار ہے۔ لہٰذا اس کے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں ہے، اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الٰہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو، اصلاً غلط ہے، خواہ وہ دعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو، یا سفارشی بنانے کا فعل ہو، یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔ یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں، کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سنیے۔

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۴﴾ (الزخرف ۸۴)

وہی ہے جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی الٰہ ہے اور وہی حکیم اور علیم ہے (یعنی آسمان وزمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے)

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ... اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (نحل ۱۷.....۲۲)

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور جو پیدا نہیں کرتا دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟..... خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے، بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں..... تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ٘ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳﴾ (فاطر ۳)

لوگو! تم پر اللہ کا جو احسان ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِهٖ ؕ (انعام ۴۶)

کہو! تم نے کبھی سوچا کہ اللہ تمہاری سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کر لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا کون سا الٰہ ہے جو یہ چیزیں تمہیں لا دے گا؟

وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ ٞ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِیْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ (قصص ۷۰۔۷۲)

اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ اسی کے لیے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور وہی اکیلا صاحب حکم واقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے روز قیامت تک رات طاری کر دے تو اس کے سوا کون سا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دے گا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اس کے سوا اور کون سا الٰہ ہے جو تمہیں رات لا دے گا کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ وَ مَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ ﴿۲۲﴾ وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ (السبا ۲۲۔۲۳)

کہو کہ اللہ کے سوا تم نے جن کو کچھ سمجھ رکھا ہے انہیں پکار کر دیکھو۔ وہ نہ آسمانوں میں ذرّہ برابر کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں، نہ آسمان و زمین کے انتظام میں ان کی کوئی شرکت ہے، نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے، اور نہ اللہ کے ہاں کوئی سفارش کام آتی ہے بجز اس کے جس کے حق میں اللہ خود ہی سفارش کی اجازت دے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ یُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ...

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۭ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ (الزمر ۵-۶)

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر چڑھا کر لاتا ہے، اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے اور ہر ایک اپنی مدت مقررہ تک چل رہا ہے...... اس نے ایک نفس سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی (یعنی انسانی زندگی کا آغاز کیا) پھر اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لیے مویشیوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں اسی طرح پیدا کرتا ہے کہ تین[1] پردوں کے اندر تمہاری تخلیق کے یکے بعد دیگرے کئی مدارج طے ہوتے ہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اقتدارِ حکومت اسی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پھر تم کدھر پھیرے جا رہے ہو؟

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَاۗىِٕقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْۗءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاۗءَ الْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (النمل ۶۰-۶۴)

کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر وہ خوش منظر باغ اگائے۔ جن کے درخت اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں شریک ہے؟ مگر یہ لوگ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں دریا جاری کیے اور اس کے لیے پہاڑوں کو لنگر بنایا اور دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں شریک ہے؟ مگر اکثر مشرکین بے علم ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو اضطرار کی حالت میں آدمی کی دعا سنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو تم کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے؟ (تصرف کے اختیارات دیتا ہے) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر تم کم ہی دھیان کرتے ہو۔ پھر وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور تری کے اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے اور اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری لانے والی ہوائیں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ اللہ بالاتر ہے ان کے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا اور اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ کہو اگر تم اپنے شرک میں سچے ہو تو اس پر دلیل لاؤ۔[2]

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـــًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝ (الفرقان ۲-۳)

وہ جو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک ہے اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور اقتدارِ حکومت میں جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر چیز کے لیے پورا پورا اندازہ مقرر کیا۔ لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے الٰہ بنا لیے ہیں جو کسی کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جن کو موت اور زندگی اور دوبارہ پیدائش پر کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔

---

[1] تین پردوں سے مراد پیٹ، رحم اور مشیمہ ہیں۔

[2] یعنی اگر تم مانتے ہو کہ یہ سب کام اللہ ہی کے ہیں اور ان کاموں میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو آخر کس دلیل سے تم الٰہیت میں اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہو؟ جن کے پاس اقتدار نہیں اور زمین و آسمان میں جن کا کوئی خود مختارانہ کام نہیں وہ الٰہ کیسے ہو گئے۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ﴿۱۰۲﴾ (انعام ۱۰۲۔۱۰۳)

آسمان وزمین کوعدم سے وجود میں لانے والا۔اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔اس نے تو ہر چیز کو پیدا کیا ہےاور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔یہ ہے اللہ تمہارا رب،کوئی اس کے سوا الٰہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق،لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کی حفاظت وخبر گیری کا کفیل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ۙ (بقرہ ۱۶۵)

بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدائی کا شریک ومماثل قرار دیتے ہیں اور اللہ کی طرح ان کو بھی محبوب رکھتے ہیں، حالانکہ جو ایمان لانے والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔کاش یہ ظالم اس حقیقت کو جسے نزولِ عذاب کے وقت محسوس کریں گے۔آج ہی محسوس کر لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے پاس ہے۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيۡتُوۡنِىۡ بِكِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ هٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَةٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۴﴾ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ يَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَنۡ لَّا يَسۡتَجِيۡبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ (احقاف ۴۔۵)

کہو تم نے اپنے معبودوں کی حالت پر کبھی غور بھی کیا جنہیں تم خدا کے بجائے حاجت روائی کے لیے پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین کا کتنا حصہ ان کا بنایا ہوا ہے، یا آسمان کی پیدائش میں ان کی کس قدر شرکت ہے؟......اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتا۔[1]

لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسۡـئَلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـئَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾ (انبیاء ۲۲۔۲۳)

اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوتے تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جاتا پس اللہ جو عرش (یعنی کائنات کے تخت سلطنت) کا مالک ہے ان تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔وہ اپنے کسی فعل کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ (المومنون ۹۱)

اللہ نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ اُس کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے۔اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو لے کر الگ ہو جاتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔

قُلۡ لَّوۡ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوۡلُوۡنَ اِذًا لَّابۡتَغَوۡا اِلٰى ذِى الۡعَرۡشِ سَبِيۡلًا ﴿۴۲﴾ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا ﴿۴۳﴾ (بنی اسرائیل ۴۲۔۴۳)

اے نبی کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوتے جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے، تو وہ مالک عرش کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے ضرور تدبیریں تلاش کرتے۔پاک ہے وہ اور بہت بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ان آیات میں اوّل سے آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ الٰہیت واقتدار لازم وملزوم ہیں اور اپنی روح ومعنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہوسکتا۔اور اسے الٰہ نہ ہونا چاہئے۔کیونکہ الٰہ سے تمہاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں یا جن ضروریات کی خاطر تمہیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے، ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی ہے، حقیقت کے

---

[1] یعنی اس کی درخواست کے جواب میں کوئی کارروائی نہیں کرسکتا۔

خلاف ہے، اور اس کی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے۔

اس مرکزی خیال کو لے کر قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے اس کے مقدمات اور نتائج حسب ذیل ترتیب کے ساتھ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں:

۱۔ حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبر گیری و حفاظت اور استجابت دعوات، جن کو تم نے معمولی کام سمجھ رکھا ہے، دراصل یہ معمولی کام نہیں ہیں بلکہ ان کا سر رشتہ پورے نظامِ کائنات کی تخلیقی اور انتظامی قوتوں سے جا ملتا ہے۔ تمہاری ذرا سی ضرورتیں جس طرح پوری ہوتی ہیں اس پر غور کرو تو معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانہ میں بے شمار اسباب کی مجموعی حرکت کے بغیر ان کا پورا ہونا محال ہے۔ پانی کا ایک گلاس جو تم پیتے ہو، اور گیہوں کا ایک دانہ جو تم کھاتے ہو اس کو مہیا کرنے کے لیے سورج اور زمین اور ہواؤں اور سمندروں کو خدا جانے کتنا کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ چیزیں تم کو بہم پہنچتی ہیں۔ پس تمہاری دعائیں سننے اور تمہاری حاجتیں رفع کرنے کے لیے کوئی معمولی اقتدار نہیں بلکہ وہ اقتدار درکار ہے جو زمین و آسمان پیدا کرنے کے لیے، سیاروں کو حرکت دینے کے لیے، ہواؤں کو گردش دینے اور بارش برسانے کے لیے، غرض پوری کائنات کا انتظام کرنے کے لیے درکار ہے۔

۲۔ یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلق کا اقتدار کسی کے پاس ہو، اور رزق کا کسی اور کے پاس۔ سورج کسی کے قبضہ میں ہو اور زمین کسی اور کے قبضہ میں، پیدا کرنا کسی کے اختیار میں ہو، بیماری و صحت کسی اور کے اختیار میں، اور موت اور زندگی کسی تیسرے کے اختیار میں، اگر ایسا ہوتا تو یہ نظامِ کائنات کبھی چل ہی نہ سکتا۔ لہٰذا تمام اقتدارات و اختیارات کا ایک ہی مرکزی فرمانروا کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے۔ کائنات کا انتظام چاہتا ہے کہ ایسا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہے۔

۳۔ جب تمام اقتدار ایک ہی فرماں روا کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار میں کسی کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے، تو لامحالہ الوہیت بھی بلکہ اسی فرمانروا کے لیے خاص ہے اور اس میں بھی کوئی حصہ دار نہیں ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ تمہاری فریاد رسی کر سکے، دعائیں قبول کر سکے، پناہ دے سکے، حامی و ناصر اور ولی و کارساز بن سکے، نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ لہٰذا الٰہ کا جو مفہوم بھی تمہارے ذہن میں ہے اس کے لحاظ سے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کوئی اس معنی میں بھی الٰہ نہیں کہ فرمانروائے کائنات کے ہاں مقرب بارگاہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کا کچھ زور چلتا ہو اور اس کی سفارش مانی جاتی ہو۔ اس کے انتظام سلطنت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ کوئی اس کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ اور سفارش قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اسی کے اختیار میں ہے۔ کوئی زور کسی کے پاس نہیں ہے کہ اس کے بل پر وہ اپنی سفارش قبول کرا سکے۔

۴۔ اقتدارِ اعلیٰ کی وحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت و فرمانروائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اور حاکمیت کا کوئی جز بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب رزاق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب پورے نظامِ کائنات کا مدبر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، تو یقیناً حاکم و آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیے اور اقتدار کی اس شق میں بھی کسی کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح اس کی سلطنت کے دائرے میں اس کے سوا کسی دوسرے کا فریاد رس اور حاجت روا اور پناہ دہندہ ہونا غلط ہے، اسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور خود مختار فرماں روا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔ تخلیق اور رزق رسانی، احیاء اور اماتت تسخیر شمس و قمر اور تکویر لیل و نہار، قضا و قدر، حکم اور بادشاہی، امر اور تشریع سب ایک ہی کلی اقتدار و حاکمیت کے مختلف پہلو ہیں اور یہ اقتدار و حاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ویسا ہی شرک کرتا ہے جیسا کہ ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ تمہارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ میں ہوں۔ اسی لیے جہاں خلق اور تقدیر اشیاء اور تدبیر کائنات میں اللہ کے لاشریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں لَهُ الْحُكْمُ اور لَهُ الْمُلْكُ اور لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ بھی کہا گیا ہے جو اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ الوہیت کے مفہوم میں بادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے اور توحید الٰہ کے لیے لازم ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے اس کو اور زیادہ کھول کر حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (آل عمران ٢٦)

کہو یا اللہ تو جو ملک کا مالک ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کردے۔ سب بھلائی (اللہ) ہی کے اختیار میں ہے۔ بلاشبہ (اللہ) ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ (المومنون ١١٦)

پس بالا و برتر ہے اللہ جو حقیقی بادشاہ ہے اس کے سوا کوئی الہٰ نہیں وہ عرشِ بزرگ کا مالک ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ (الناس ١-٣)

کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب سے، انسانوں کے بادشاہ سے، انسانوں کے الہٰ سے۔

اور اس سے زیادہ تصریح سورۃ المؤمن میں ہے جہاں فرمایا:

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ (المومن ١٦)

یعنی جس روز سب لوگ بے نقاب ہوں گے، کسی کا کوئی راز اللہ سے چھپا نہ ہوگا، اس وقت پکارا جائے گا کہ آج بادشاہی کس کی ہے؟ اور جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اس اکیلے اللہ کی جس کا اقتدار سب پر غالب ہے۔

اس آیت کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

اِنَّهُ تَعَالٰى يَطْوِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِيَدِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَنَا الْجَبَّارُ اَنَا الْمُتَكَبِّرُ اَيْنَ مُلُوْكُ الْاَرْضِ؟ اَيْنَ الْجَبَّارُوْنَ؟ اَيْنَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ؟

اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اپنی مٹھی میں لے کر پکارے گا میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، کہاں ہیں وہ جو زمین میں بادشاہ بنتے تھے؟ کہاں ہیں جبار؟ کہاں ہیں متکبر، عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ میں یہ الفاظ فرما رہے تھے اس وقت آپ پر ایسا لرزہ طاری تھا کہ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ ممبر سے گر نہ پڑیں۔

رَبّ

لغوی تحقیق

اس لفظ کا مادہ "ر ب" ہے جس کا ابتدائی واساسی مفہوم پرورش ہے۔ پھر اسی سے تصرف، خبر گیری، اصلاحِ حال اور اتمام وتکمیل کا مفہوم پیدا ہوا۔ پھر اسی بنیاد پر فوقیت، سیادت، مالکیت اور آقائی کے مفہومات اس میں پیدا ہو گئے۔ لغت میں اس کے استعمالات کی چند مثالیں ہیں:

۱۔ پرورده کرنا، نشوونما دینا، بڑھانا۔ مثلاً ربیب اور ربیبہ پروردہ لڑکے اور لڑکی کو کہتے ہیں۔ نیز اس بچے کو بھی ربیب کہتے ہیں جو سوتیلے باپ کے گھر پرورش پائے۔ پالنے والی دائی کو بھی ربیبہ کہتے ہیں۔ رابہ سوتیلی ماں کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ ماں تو نہیں ہوتی مگر بچے کو پرورش کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے راب سوتیلے باپ کو کہتے ہیں۔ مربب یا مربی اسی دوا کو کہتے ہیں جو محفوظ کر کے رکھی جائے۔ رَبَّ۔ يُرَبُّ۔ رَبًّا کے معنی اضافہ کرنے بڑھانے اور تکمیل کو پہنچانے کے ہیں۔ جیسے رَبَّ النِّعْمَةَ یعنی احسان میں اضافہ کیا یا احسان کی حد کر دی۔

۲۔ سمیٹنا، جمع کرنا، فراہم کرنا۔ مثلاً کہیں گے فَلَانٌ يَرُبُّ النَّاسَ یعنی فلاں شخص لوگوں کو جمع کرتا ہے، یا سب لوگ اس شخص پر مجتمع ہوتے ہیں۔ جمع ہونے کی جگہ کو مرب کہیں گے۔ سمٹنے اور فراہم ہو جانے کو تَرَبُّب کہیں گے۔

۳۔ خبر گیری کرنا، اصلاحِ حال کرنا، دیکھ بھال اور کفالت کرنا۔ مثلاً رَبّع ضَيْعَتَهُ کے معنی ہوں گے فلاں شخص نے اپنی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کی۔ ابوسفیان سے صفوان نے کہا تھا لَانْ يَرُبَّنِي رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ يَرُبَّنِي رَجُلٌ مِنْ هَوَازِن یعنی قریش میں سے کوئی شخص مجھے اپنی ربوبیت (سرپرستی) میں لے لے یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی آدمی ایسا کرے۔ علقمہ بن عبیدہ کا شعر ہے۔

وَ كُنْتَ امْرًا اَفْضَتْ اِلَيْكَ رَبَابَتِيْ

وَقَبْلَكَ رَبَّتْنِيْ فَضِعْتُ رُبُوْبِيْ

یعنی تجھ سے پہلے جو رئیس میرے مربی تھے انہیں میں نے کھو دیا، آخر کار اب میری کفالت و ربابت تیرے ہاتھ آئی ہے۔ فرزدق کہتا ہے:

كانوا كَسَائِلَةٍ حَمْقَاءَ اِذْ حَقَنَتْ

سَلَاءَهَا فِيْ اَدِيمٍ غَيْرِ مَرْبُوبِ

اس شعر میں ادیب غیر مربوب سے مراد وہ چمڑا ہے جو کمایا نہ گیا ہو، جسے دباغت دے کر درست نہ کیا گیا ہو۔ فلان یرب صنعته عند فلان کے معنی ہوں گے فلاں شخص فلاں کے پاس اپنے پیشہ کا کام کرتا ہے یا اس سے کاریگری کی تربیت حاصل کرتا ہے۔

۴۔ فوقیت، بالادستی، سرداری، حکم چلانا، تصرف کرنا۔ مثلاً قد رب فلان قومه۔ یعنی فلاں شخص نے اپنی قوم کو اپنا تابع کر لیا۔ ربیت القوم یعنی میں نے قوم پر حکم چلایا اور بالادست ہو گیا۔ لبید بن ربیعہ کہتا ہے۔

وَاَهْلَكْنَ يَوْمًا رَبَّ كِنْدَةَ وَابْنَهٗ

وَرَبَّ مَعَدٍّ بَيْنَ خَبْتٍ وَعَرْعَرٍ

یہاں رب کندہ سے مراد کندہ کا سردار ہے جس کا حکم اس قبیلہ میں چلتا تھا۔ اس معنی میں نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

تَخِبُّ اِلَى النُّعْمَانِ حَتّٰى تَنَالَهٗ

فِدًى لَكَ مِنْ رَّبٍّ تَلِيْدِىْ وَطَارِ فِىْ

۵۔ مالک ہونا، مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص سے نبی ﷺ نے پوچھا اَرَبُّ غَنَمٍ اَمْ رَبُّ ابل؟ تو بکریوں کا مالک ہے یا اونٹوں کا؟ اس معنی میں گھر کے مالک کو رَبُّ الدَّارِ اونٹنی کے مالک کو رَبُّ النَاقَۃ جائداد کے مالک کو رب الضیعه کہتے ہیں۔ آقا کے معنی میں بھی رب کا لفظ آتا ہے اور عبد، یعنی غلام کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔

غلطی سے رب کے لفظ کو محض پروردگار کے مفہوم تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے اور ربوبیت کی تعریف میں یہ فقرہ چل پڑا ہے کہ هو اَنْشَا الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ (یعنی ایک چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر پایۂ کمال کو پہنچانا) حالانکہ یہ اس لفظ کے وسیع معانی میں سے صرف ایک معنی ہے۔ اس کی پوری وسعتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ حسب ذیل مفہومات پر حاوی ہے:

۱۔ پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا۔ تربیت اور نشوونما دینے والا۔

۲۔ کفیل، خبر گیراں، دیکھ بھال اور اصلاحِ حال کا ذمہ دار۔

۳۔ وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو، جس میں متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں۔

۴۔ سید مطاع، سردار ذی اقتدار، جس کا حکم چلے، جس کی فوقیت و بالادستی تسلیم کی جائے، جس کو تصرف کے اختیارات ہوں۔

۵۔ مالک، آقا۔

قرآن میں لفظ رب کے استعمالات:

قرآن مجید میں یہ لفظ ان سب معانی میں آیا ہے۔ کہیں ان میں سے کوئی ایک یا دو معنی مراد ہیں، کہیں اس سے زائد اور کہیں پانچوں معنی۔ اس بات کو ہم آیاتِ قرآنی سے مختلف مثالیں دے کر واضح کریں گے۔

پہلے معنی میں:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ (یوسف ۲۳)

اس نے کہا کہ پناہ بخدا! وہ تو میرا رب ہے[1] جس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔

دوسرے معنی میں جس کے ساتھ پہلے معنی کا تصور بھی کم وبیش شامل ہے:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ (الشعراء ۷۷۔۸۰)

تمہارے یہ معبود تو میرے دشمن ہیں، بجز رب کائنات کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جو میری رہنمائی کرتا ہے، جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ (النحل ۵۳۔۵۴)

تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی سے حاصل ہوئی ہے، پھر جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم گھبرا کر رجوع کرتے ہو مگر جب وہ تم پر سے مصیبت ٹال دیتا ہے تو کچھ لوگ تم میں ایسے ہیں جو اپنے رب کے ساتھ (اس نعمت کی بخشش اور اس مشکل کشائی میں) دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ (انعام ۱۶۵)

کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں۔ حالانکہ ہر چیز کا رب وہ ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا ﴿۹﴾ (المزمل ۹)

وہ مغرب و مشرق کا رب ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسی کو اپنا وکیل (اپنے سارے معاملات کا کفیل و ذمہ دار) بنا لے۔

تیسرے معنی میں:

هُوَ رَبُّكُمْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ (هود۔ ۳۴)

وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹا کر لے جائے جاؤ گے۔

---

[1] کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حضرت یوسف عزیز مصر کو اپنا رب فرما رہے ہیں، جیسا کہ بعض مفسرین کو شبہ ہوا ہے، بلکہ دراصل ''وہ'' کا اشارہ خدا کی طرف ہے جس کی پناہ انہوں نے مانگی ہے۔ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ جب مشارٌ الیہ قریب ہی مذکور ہے تو کوئی غیر مذکور مشارٌ الیہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت؟

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ (الزمر ۷)

پھر تمہارے رب کی طرف تمہاری واپسی ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا (سبا ۲۶)

کہو کہ ہم دونوں فریقوں کو ہمارا رب جمع کرے گا۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ (انعام ۳۸)

زمین میں چلنے والا کوئی جاندار اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری ہی طرح ایک امت نہ ہو اور ہم نے اپنے دفتر میں کسی کے اندراج سے کوتاہی نہیں کی ہے۔ پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائیں گے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ (یس ۵۱)

اور جونہی کہ صور پھونکا جائے گا وہ سب اپنے ٹھکانوں سے اپنے رب کی طرف نکل پڑیں گے۔

چوتھے معنی میں جس کے ساتھ کم وبیش تیسرے معنی کا تصور بھی موجود ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ ۳۱)

انہوں نے اللہ کے بجائے علما اور درویشوں کو اپنا رب بنالیا۔

وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ (آل عمران ۶۴)

اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔

دونوں آیتوں میں ارباب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو قوموں اور گروہوں نے مطلقاً اپنا رہنما و پیشوا مان لیا ہو۔ جن کے امر و نہی، ضابطہ و قانون اور تحلیل و تحریم کو بلا کسی سند کے تسلیم کیا جاتا ہو۔ جنہیں بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار سمجھا جاتا ہو۔

اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ ... وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (یوسف ۴۱-۴۲)

یوسف (علیہ السلام) نے کہا کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب کو شراب پلائے گا......اور ان دونوں میں سے جس کے متعلق یوسفؑ کا خیال تھا کہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسفؑ نے کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا، مگر شیطان نے اسے بھلاوے میں ڈال دیا اور اس کو اپنے رب سے یوسفؑ کا ذکر کرنے کا خیال نہ رہا۔

فَلَمَّا جَاۗءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ (یوسف ۵۰)

جب پیغام لانے والا یوسف علیہ السلام کے پاس آیا تو یوسف علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ میرا رب تو ان کی چال سے باخبر ہے ہی۔

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام نے مصریوں سے خطاب کرتے ہوئے بار بار فرعون مصر کو ان کا رب قرار دیا ہے، اس لیے کہ جب وہ اس کی مرکزیت اور اس کا اقتدارِ اعلیٰ اور اس کو امر و نہی کا مالک تسلیم کرتے تھے، تو وہی ان کا رب تھا۔ برعکس اس کے خود حضرت یوسف علیہ السلام اپنا رب اللہ کو قرار دیتے ہیں، کیونکہ وہ فرعون کو

نہیں، صرف اللہ کو مقتدرِ اعلیٰ اور صاحب امر و نہی مانتے تھے۔

پانچویں معنی میں:

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ (قریش ۳۔۴)

لہٰذا انہیں اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے جس نے ان کی رزق رسانی کا انتظام کیا ہے اور انہیں بدامنی سے محفوظ رکھا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ (صفت ۱۸۰)

تیرا رب جو عزت و اقتدار کا مالک ہے ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (انبیاء ۲۲)

اللہ جو عرش کا مالک ہے ان تمام صفاتِ عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (المؤمنون ۸۶)

پوچھو کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرش بزرگ کا مالک کون ہے؟

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۭ (الصفت ۵)

وہ جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں اور سب چیزوں کا جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۙ (النجم ۴۹)

اور یہ کہ ستارہ شعریٰ کا مالک بھی وہی ہے۔

ربوبیت کے باب میں گمراہ قوموں کے تخیلات:

ان شواہد سے لفظ رب کے معانی بالکل غیر مشتبہ طور پر معین ہوجاتے ہیں۔اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ربوبیت کے متعلق گمراہ قوموں کے وہ کیا تخیلات تھے جن کی تردید کرنے کے لیے قرآن آیا، اور کیا چیز ہے جس کی طرف قرآن بلاتا ہے۔اس سلسلہ میں زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن گمراہ قوموں کا ذکر قرآن نے کیا ہے ان کو الگ الگ لے کر ان کے خیالات سے بحث کی جائے تاکہ بات بالکل منقح ہوجائے۔

قوم نوح علیہ السلام:

سب سے پہلی قوم جس کا ذکر قرآن کرتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ہے۔قرآن کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں ان کا یہ قول خود قرآن نے نقل کیا ہے:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ۚ (المومنون ۲۴)

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر تم جیسا ایک انسان۔یہ دراصل تم پر اپنی فضیلت جمانا چاہتا ہے۔ورنہ اگر اللہ کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔

انہیں اللہ کے خالق ہونے اور پہلے اور دوسرے معنی میں اس کے رب ہونے سے بھی انکار نہ تھا۔چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام جب ان سے کہتے ہیں کہ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ [1] (ہود ۳۴) اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ [2] (نوح ۱۰) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ [3] (نوح ۱۵۔۱۶) تو ان میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ اللہ ہمارا رب نہیں ہے، یا زمین و آسمان کو اور ہم کو اس نے پیدا نہیں کیا ہے، یا زمین و آسمان کا یہ سارا انتظام وہ نہیں کر رہا ہے۔پھر ان کو اس بات سے بھی انکار نہ تھا کہ اللہ ان کا الٰہ ہے۔اسی لیے تو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت ان کے سامنے ان الفاظ میں پیش کی کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اس کے سوا تمہارے لیے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے) ورنہ وہ اگر اللہ کے الٰہ ہونے سے منکر ہوتے تو دعوت کے الفاظ یہ ہوتے اِتَّخِذُوا اللّٰهَ اِلٰهًا (اللہ کو اپنا الٰہ بنالو)۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان نزاع کس بات پر تھی؟ آیاتِ قرآنی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ بنائے نزاع دو باتیں تھیں۔

ایک یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم یہ تھی کہ جو رب العالمین ہے، جسے تم بھی مانتے ہو کہ تمہیں اور تمام کائنات کو اسی نے وجود بخشا ہے اور وہی تمہاری ضروریات کا کفیل ہے، دراصل وہی اکیلا تمہارا الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔کوئی اور ہستی نہیں ہے جو تمہاری حاجتیں پوری کرنے والی، مشکلیں آسان کرنے والی، دعائیں سننے اور مدد کو پہنچنے والی ہو۔لہٰذا تم اسی کے آگے سر نیاز جھکاؤ۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ ... وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ (اعراف ۵۹۔۶۲)

اے برادران قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارے لیے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے......مگر میں رب العالمین کی طرف سے پیغامبر ہوں۔تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔

---

[1] وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

[2] اپنے رب سے معافی چاہو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

[3] کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اوپر تلے سات آسمان پیدا کیے اور اُن میں چاند کو روشن کیا اور سورج کو چراغ (کی مانند روشن کیا) اور اللہ نے تم کو زمین سے خاص طور پر سبزے کی طرح اُگایا۔

برعکس اس کے وہ لوگ اس بات مصر تھے کہ رب العالمین تو اللہ ہی ہے مگر دوسرے بھی خدائی کے انتظام میں تھوڑا بہت دخل رکھتے ہیں، اور ان سے بھی ہماری حاجتیں وابستہ ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ ہم دوسروں کو الٰہ مانیں گے:

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ (نوح ۲۳)

ان کے سرداروں اور پیشواؤں نے کہا کہ لوگو! اپنے الٰہوں کو نہ چھوڑو ودّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ صرف اسی معنی میں اللہ کو رب مانتے تھے کہ وہ ان کا خالق، زمین و آسمان کا مالک اور کائنات کا مدبر اعلیٰ ہے۔ لیکن اس بات کے قائل نہ تھے کہ اخلاق، معاشرت، تمدن، سیاست اور تمام معاملات زندگی میں بھی حاکمیت و اقتدار اعلیٰ اسی کا حق ہے، وہی رہنما، وہی قانون ساز، وہی صاحب امر و نہی بھی ہے اور اسی کی اطاعت بھی ہونی چاہیے۔ ان سب معاملات میں انہوں نے اپنے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو رب بنا رکھا تھا۔ برعکس اس کے حضرت نوح علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ ربوبیت کے ٹکڑے نہ کرو۔ تمام مفہومات کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کو رب تسلیم کرو، اور اس کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو قوانین اور احکام میں تمہیں پہنچاتا ہوں ان کی پیروی کرو۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (الشعراء ۱۰۷۔۱۰۸)

میں تمہارے لیے خدا کا معتبر رسول ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

قومِ عاد علیہ السلام:

قوم نوح علیہ السلام کے بعد قرآن قوم عاد کا ذکر کرتا ہے۔ یہ قوم بھی اللہ کی ہستی سے منکر نہ تھی۔ اس کے الٰہ ہونے سے بھی اس کو انکار نہ تھا۔ جس معنی میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اللہ کو رب تسلیم کرتی تھی اس معنی میں یہ قوم بھی اللہ کو رب مان رہی تھی۔ البتہ بنائے نزاع وہی دو امور تھے جو اوپر قوم نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی حسب ذیل تصریحات اس پر صاف دلالت کرتی ہیں:

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ ... قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ (اعراف ۶۵۔۷۰)

عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے برادرانِ قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں...... انہوں نے جواب دیا کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہم بس اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کے وقتوں سے ہوتی آرہی ہے۔

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (حم السجدہ ۱۴)

انہوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیج سکتا تھا۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾ (ہود ۵۹)

اور یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اس کے رسولوں کی اطاعت قبول نہ کی، اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی اختیار کر لی۔

قومِ ثمود علیہ السلام:

اب ثمود کو لیجیے جو عاد کے بعد سب سے بڑی سرکش قوم تھی۔ اصولاً اس کی گمراہی بھی اس قسم کی تھی جو قومِ نوح علیہ السلام اور قومِ عاد کی بیان ہوئی ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے سے انکار نہ تھا، اس کی عبادت سے بھی انکار نہ تھا۔ بلکہ انکار اس بات سے تھا کہ اللہ ہی الٰہ واحد ہے، صرف وہی عبادت کا مستحق ہے، اور ربوبیت اپنے تمام معانی کے ساتھ اکیلے اللہ ہی کے لیے خاص ہے وہ اللہ کے سوا دوسروں کو بھی فریاد رس، حاجت روا، اور مشکل کشا ماننے پر اصرار کرتے تھے۔ اور اپنی اخلاقی وتمدنی زندگی میں اللہ کے بجائے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کرنے اور ان سے اپنی زندگی کا قانون لینے پر مصر تھے۔ یہی چیز بالآخران کے ایک فسادی قوم بن جانے اور مبتلائے عذاب ہونے کی موجب ہوئی۔ اس کی توضیح حسب ذیل آیات سے ہوتی ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿١٣﴾ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿١٤﴾ (حم السجدہ ۱۳۔۱۴)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر یہ لوگ تمہاری پیروی سے منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ عاد اور ثمود کو جو سزا ملی تھی ویسی ہی ایک ہولناک سزا سے میں تم کو ڈراتا ہوں۔ جب ان قوموں کے پاس ان کے پیغمبر آگے اور پیچھے سے آئے اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا تم جو کچھ لے کر آئے ہو اسے ہم نہیں مانتے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ ... قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (ھود ۶۱۔۶۲)

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی پرستش و بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے...... انہوں نے کہا صالح! اس سے پہلے تو ہماری بڑی امیدیں تم سے تھیں، کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾ ... وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ (الشعراء ۱۴۲۔۱۵۲)

جب ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے ان سے کہا کہ کیا تمہیں اپنے بچاؤ کی کوئی فکر نہیں؟ دیکھو میں تمہارے اللہ کا معتبر رسول ہوں لہٰذا اللہ کی ناراضی سے بچو اور میری اطاعت قبول کرو......اور ان حد سے گزرنے والوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

قومِ ابراہیم ونمرود:

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا نمبر آتا ہے۔ اس قوم کا معاملہ خاص طور پر اس لیے اہم ہے کہ اس کے بادشاہ نمرود کے متعلق یہ عام غلط فہمی ہے کہ وہ اللہ کا منکر اور خود خدا ہونے کا مدعی تھا۔ حالانکہ وہ اللہ کی ہستی کا قائل تھا، اس کے خالق و مدبر کائنات ہونے کا معتقد تھا، اور صرف تیسرے، چوتھے اور پانچویں معنی کے اعتبار سے اپنی ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ نیز یہ بھی عام غلط فہمی ہے کہ یہ قوم اللہ سے بالکل ناواقف تھی اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کی سرے سے قائل ہی نہ تھی۔ حالانکہ فی الواقع اس قوم کا معاملہ قومِ نوح اور عاد اور ثمود سے کچھ بھی مختلف نہ تھا۔ وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتی تھی، اس کا رب ہونا اور خالق ارض وسما اور مدبر کائنات ہونا بھی اسے معلوم تھا، اس کی عبادت سے بھی وہ منکر نہ تھی۔ البتہ اس کی گمراہی یہ تھی کہ ربوبیت بمعنی اول ودوم میں اجرام فلکی کو حصہ دار سمجھتی تھی۔ اور اس بناء پر اللہ کے ساتھ ان کو بھی معبود قرار دیتی تھی اور ربوبیت بمعنی سوم و چہارم و پنجم کے اعتبار سے اس نے اپنے بادشاہوں کو رب بنا رکھا تھا۔ قرآن کی تصریحات

اس بارے میں اتنی واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کس طرح لوگ اصل معاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے......سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آغازِ ہوش کا وہ واقعہ لیجیے جس میں نبوت سے پہلے ان کی تلاش حق کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا‌ ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَـئِنۡ لَّمۡ يَهۡدِنِىۡ رَبِّىۡ لَاَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّيۡنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمۡسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ هٰذَاۤ اَكۡبَرُ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتۡ قَالَ يٰقَوۡمِ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ۝ اِنِّىۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِىَ لِلَّذِىۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا‌ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ‌ ۝ (انعام ۷۶۔۷۹)

جب اسی پر رات طاری ہوی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہنے لگا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ تارا ڈوب گیا تو اس نے کہا ڈوبنے والوں کو تو میں پسند نہیں کرتا۔ پھر جب چاند چمکتا ہوا دیکھا تو کہا، یہ میرا رب ہے مگر وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا، اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو یہ خطرہ ہے کہ کہیں میں بھی ان گمراہ لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی چھپ گیا تو وہ پکار اٹھا کہ اے برادرانِ قوم جو شرک تم کرتے ہو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں میں نے تو سب طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اس کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

خط کشیدہ فقروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس سوسائٹی میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آنکھ کھولی تھی اس میں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے کا تصور اور اس ذات کے رب ہونے کا تصور ان سیاروں کی ربوبیت کے تصور سے الگ موجود تھا۔ اور آخر کیوں نہ موجود ہوتا جب کہ یہ لوگ ان مسلمانوں کی نسل سے تھے جو حضرت نوح (علیہ السلام) پر ایمان لائے تھے، اور ان کی قریبی رشتہ دار ہمسایہ اقوام (عاد وثمود) میں پے در پے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے دینِ اسلام کی تجدید بھی ہوتی چلی آ رہی تھی (جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ) پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کے فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اور رب ہونے کا تصور تو اپنے ماحول سے مل چکا تھا، البتہ جو سوالات ان کے دل میں کھٹکتے تھے وہ یہ تھے کہ نظامِ ربوبیت میں اللہ کے ساتھ چاند، سورج اور سیاروں کے شریک ہونے کا جو تخیل ان کی قوم میں پایا جاتا ہے اور جس کی بنا پر یہ لوگ عبادت میں بھی اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہرا رہے ہیں، یہ کہاں تک مبنی برحقیقت[1] ہے۔ چنانچہ نبوت سے پہلے اسی کی جستجو انہوں نے کی اور طلوع و غروب کا انتظام ان کے لیے اس امرِ واقعی تک پہنچنے میں دلیل راہ بن گیا کہ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ اسی بنا پر چاند کو غروب ہوتے دیکھ کر وہ فرماتے ہیں کہ اگر میرے رب، یعنی اللہ نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو خوف ہے کہ کہیں میں حقیقت تک رسائی پانے سے نہ رہ جاؤں، اور ان مظاہر سے دھوکا نہ کھا جاؤں جن سے میرے گردوپیش لاکھوں انسان دھوکا کھا رہے ہیں۔

پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے اور انہوں نے دعوتِ الی اللہ کا کام شروع کیا تو جن الفاظ میں وہ اپنی دعوت پیش فرماتے تھے ان پر غور کرنے سے وہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَكَيۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَكۡتُمۡ وَلَا تَخَافُوۡنَ اَنَّكُمۡ اَشۡرَكۡتُمۡ بِاللّٰهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطٰنًا‌ ؕ (انعام ۸۱)

اور آخر میں ان سے کس طرح ڈر سکتا ہوں جنہیں تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو، جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے الٰہیت و ربوبیت میں شریک ہونے پر اللہ نے تمہارے پاس کوئی سند نہیں بھیجی ہے۔

---

[1] یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن اُر کے متعلق آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں میں جو انکشافات ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چندرماں دیوتا کی پرستش ہوتی تھی جسے ان کی زبان میں ''ننار'' کہا جاتا تھا۔ اور اس کے ہمسایہ علاقہ میں جس کا مرکز تو سہ تھا سورج دیوتا کی عبادت ہوتی تھی جس کا نام ان کی زبان میں شماس تھا۔ اس ملک کے فرماں روا خاندان کا بانی ارنمو تھا جو عرب میں جا کر نمرود ہو گیا اور اسی کے نام پر وہاں کے فرماں روا کا لقب ہی نمرود قرار پایا، جیسے نظام الملک کے جانشین نظام کہلاتے ہیں۔

وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (مریم ۴۸)

تم اللہ کے سوا اور جن جن سے دعائیں مانگتے ہو ان سے میں دست کش ہوتا ہوں۔

قَالَ بَلۡ رَّبُّکُمۡ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الَّذِیۡ فَطَرَہُنَّ ... قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا یَضُرُّکُمۡ ﴿۶۶﴾ (انبیاء ۵۶۔۶۶)

کہا تمہارا رب تو صرف آسمانوں اور زمین کا رب ہی ہے جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے...... کہا پھر کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نفع ونقصان پہنچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے۔

اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡہِ وَ قَوۡمِہٖ مَاذَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفۡکًا اٰلِـہَۃً دُوۡنَ اللّٰہِ تُرِیۡدُوۡنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّکُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۷﴾ (صافات ۸۵۔۸۷)

جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا، یہ تم کن کی عبادت کررہے ہو؟ کیا اللہ کے سوا اپنے خود ساختہ الٰہوں کی بندگی کا ارادہ ہے؟ پھر رب العلمین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ۫ کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَ بَدَا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَ الۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ (الممتحنہ ۴)

(ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھی مسلمانوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے صاف کہہ دیا) کہ ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا جن جن کی عبادت تم کرتے ہو ان سب سے کوئی تعلق نہیں، ہم تمہارے طریقے کو ماننے سے انکار کر چکے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے بغض و عداوت کی بنا پڑ گئی ہے جب تک کہ تم اکیلے اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان تمام ارشادات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مخاطب وہ لوگ نہ تھے جو اللہ سے بالکل ناواقف اور اس کے رب العلمین اور معبود ہونے سے منکر یا خالی الذہن ہوتے۔ بلکہ وہ لوگ تھے جو اللہ کے ساتھ ربوبیت (بمعنی اوّل ودوم) اور الٰہیت میں دوسروں کو شریک قرار دیتے تھے۔ اسی لیے تمام قرآن میں کسی ایک جگہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی ایسا قول موجود نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم کو اللہ کی ہستی اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کا قائل کرنے کی کوشش کی ہوگی، بلکہ ہر جگہ وہ دعوت اس چیز دیتے ہیں کہ اللہ ہی رب اور الٰہ ہے۔

اب نمرود کے معاملہ کو لیجیے۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو گفتگو ہوئی اسے قرآن اس طرح نقل کرتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ؕ (بقرہ ۲۵۸)

تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں بحث کی، اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے کہا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اچھا تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اب تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اس گفتگو سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جھگڑا اللہ کے ہونے یا نہ ہونے پر نہ تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ ابراہیم علیہ السلام "رب" کسے تسلیم کرتے ہیں۔ نمرود اوّل تو اس قوم سے تعلق رکھتا تھا جو اللہ کی ہستی کو مانتی تھی۔ دوسرے جب تک کہ وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جاتا وہ ایسی صریح احمقانہ بات کبھی نہ کہہ سکتا تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج اور چاند کو گردش دینے والا وہ خود ہے۔ پس دراصل اس کا دعویٰ یہ نہ تھا کہ میں اللہ ہوں، یا رب السموت والارض ہوں، بلکہ اس کا دعویٰ

صرف یہ تھا کہ میں اس کا مملکت کا ''رب'' ہوں جس کی رعیت کا ایک فرد ابراہیم علیہ السلام ہے۔ اور یہ رب ہونے کا دعویٰ بھی اسے ربوبیت کے پہلے اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نہ تھا، کیونکہ اس اعتبار تو خود چاند اور سورج اور سیاروں کی ربوبیت کا قائل تھا۔ البتہ وہ تیسرے، چوتھے اور پانچوں مفہوم کے اعتبار سے اپنی مملکت کا رب بنتا تھا۔ یعنی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں اس ملک کا مالک ہوں، اس کے سارے باشندے میرے بندے، میرا مرکزی اقتدار ان کے اجتماع کی بنیاد ہے، اور میرا فرمان ان کے لیے قانون ہے۔ اَنۡ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ کے الفاظ صریحاً اس بات کی طرف اشارہ کر رہے کہ اس دعوائے ربوبیت کی بنیاد بادشاہی کے زعم پر تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی رعیت میں سے ابراہیم علیہ السلام نامی ایک نوجوان اٹھا ہے جو نہ چاند اور سورج اور سیاروں کی فوق الفطری ربوبیت کا قائل بادشاہ وقت کی سیاسی وتمدنی ربوبیت تسلیم کرتا ہے، تو اس کو تعجب ہوا اور اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلا کر دریافت کیا کہ آخر تم کسے رب مانتے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلا نے پہلے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی اور موت کے اختیارات ہیں۔ مگر اس جواب سے وہ بات کی تہ کو نہ پہنچ سکا اور یہ کہہ کر اس نے اپنی ربوبیت ثابت کرنی چاہی کہ زندگی اور موت کے اختیارات تو مجھے حاصل ہیں جسے چاہوں قتل کرا دوں اور جس کی چاہوں جان بخشی کر دوں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بتایا کہ میں صرف اللہ کو رب مانتا ہوں، ربوبیت کے جملہ مفہومات کے اعتبار سے میرے نزدیک تنہا اللہ ہی رب ہے، اس نظام کائنات میں کسی دوسرے کی ربوبیت کے لیے گنجائش ہی کہاں ہوسکتی ہے جب کہ سورج کے طلوع وغروب پر وہ ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ نمرود آدمی ذی ہوش تھا۔ اس دلیل کو سن کر اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ فی الواقع اللہ کی اس سلطنت میں اس کا دعوائے ربوبیت بجز ایک زعم باطل کے اور کچھ نہیں ہے، اسی لیے وہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر نفس پرستی اور شخصی وخاندانی اغراض کی بندگی ایسی دامن گیر ہوئی کہ حق کے ظہور کے باوجود وہ خود مختارانہ حکمرانی کے منصب سے اتر کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر آمادہ نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے: وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ (مگر اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا) یعنی اس ظہور حق کے بعد جو یہ رویہ اسے اختیار کرنا چاہیے تھا اسے اختیار کرنے کے لیے جب وہ تیار نہ ہوا اور اس نے غاصبانہ فرماں روائی کر کے دنیا پر اور خود اپنے نفس پر ظلم کرنا ہی پسند کیا تو اللہ نے بھی اسے ہدایت کی روشنی عطا نہ کی، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو خود ہدایت کا طالب نہ ہو اس پر زبردستی اپنی ہدایت مسلط کر دے۔

قومِ لوط علیہ السلام:

قوم ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کی اصلاح پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام مامور کیے گئے تھے۔ اس قوم کے متعلق بھی قرآن سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اللہ کے وجود کے منکر تھی نہ اس بات کی منکر تھی کہ اللہ خالق اور رب بمعنی اول ودوم ہے۔ البتہ اسے انکار اس سے تھا کہ اللہ ہی کو تیسرے، چوتھے اور پانچویں معنی میں بھی رب مانے اور اس کے معتمد علیہ نمائندے کی حیثیت سے رسول کے اقتدار کو تسلیم کرے وہ چاہتی تھی کہ اپنی خواہش نفس کے مطابق خود جس طرح چاہے کام کرے۔ یہی اس کا اصلی جرم تھا اور اسی بنا پر وہ عذاب میں مبتلا ہوئی۔ قرآن کی حسب ذیل تصریحات اس پر شاہد ہیں:

> اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ لُوۡطٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاۡتُوۡنَ الذُّكۡرَانَ مِنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوۡنَ مَا خَلَقَ لَـكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ‌ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ عٰدُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾ (شعراء ۱۶۶۔۱۶۱)
>
> جب ان کے بھائی لوط علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم تقویٰ نہ اختیار کرو گے؟ دیکھو میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا اللہ کے غضب سے بچو اور میری اطاعت کرو۔ اس کام پر میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف رب العلمین کے ذمہ ہے۔ کیا دنیا کے لوگوں میں سے تم لڑکوں کی طرف جاتے ہو اور تمہارے رب نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو؟ تم بڑے ہی حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ خطاب ایسے ہی لوگوں سے ہوسکتا تھا جو اللہ کے وجود اور اس کے خالق اور پروردگار ہونے کے منکر نہ ہوں۔ چنانچہ جواب میں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ

اللہ کیا چیز ہے؟ یا وہ پیدا کرنے والا کون ہوتا ہے؟ یا وہ کہاں سے ہمارا رب ہو گیا؟ بلکہ کہتے یہ ہیں کہ:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ (شعراء ۱۶۷)

اے لوط! اگر تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ملک سے نکال کر باہر کیے جاؤ گے۔

دوسری جگہ اس واقعہ کو یوں فرمایا گیا ہے:

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ٘ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ (عنکبوت ۲۸۔۲۹)

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب اس نے قوم سے کہا کہ تم لوگ وہ فعل شنیع کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہ کیا تھا، کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں علانیہ ایک دوسرے کے سامنے بدکاریاں کرتے ہو؟ تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔

کیا یہ جواب کسی منکر خدا قوم کا ہو سکتا تھا؟ پس معلوم ہوا کہ ان کا اصلی جرم انکار الوہیت و ربوبیت نہ تھا، بلکہ یہ تھا کہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کو الٰہ اور رب مانتے تھے۔ لیکن اپنے اخلاق، تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کے رسول کی ہدایت پر چلنے کے لیے تیار نہ تھے۔

قومِ شعیب علیہ السلام:

اس کے بعد اہل مدین اور اصحاب الایکہ کو لیجیے جن میں حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کے قائل تھے یا نہ تھے۔ ان کی حیثیت دراصل ایک ایسی قوم کی تھی جس کی ابتدا اسلام سے ہوئی اور بعد میں وہ عقائد و اعمال کی خرابیوں میں مبتلا ہو کر بگڑتی چلی گئی۔ بلکہ قرآن سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مومن ہونے کے بھی مدعی تھے۔ چنانچہ بار بار حضرت شعیب علیہ السلام ان سے فرماتے ہیں کہ "اگر تم مومن ہو" تو تمہیں یہ کرنا چاہیے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی ساری تقریروں اور ان کے جوابات کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو اللہ کو مانتی تھی۔ اسے معبود اور پروردگار بھی تسلیم کرتی تھی، مگر دو طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ایک یہ کہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کے سوا دوسروں کو بھی الٰہ اور رب سمجھنے لگی تھی، اس لیے اس کی عبادت صرف اللہ کے لیے مختص نہ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک اللہ کی ربوبیت کو انسان کے اخلاق، معاشرت، معیشت اور تمدن و سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا، اس بنا پر وہ کہتی تھی کہ اپنی تمدنی زندگی میں ہم مختار ہیں، اپنے معاملات کو جس طرح چاہیں چلائیں۔

قرآن کی حسب ذیل آیات ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں:

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ ... وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ (اعراف ۸۵۔۸۷)

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ اس اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس روشن ہدایت آ چکی ہے۔ پس تم ناپ تول ٹھیک کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو، اور زمین

میں فساد نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح کی جا چکی تھی۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم مومن ہو...... اگر تم میں سے ایک گروہ اس ہدایت پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَ هُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ **(ھود ۸۵۔۸۷)**

اے برادرانِ قوم! پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے پورے ناپو اور تولو، لوگوں کو ان چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو۔ اللہ کی عنایت سے کاروبار میں جو بچت ہو وہی تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے، یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک دیں؟ تم ہی تو ایک بردبار اور راست باز رہ گئے ہو!

آخری خط کشیدہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ ربوبیت والوہیت کے بارے میں ان کی اصل گمراہی کیا تھی۔

فرعون اور آلِ فرعون:

اب ہمیں فرعون اور اس کی قوم کو دیکھنا چاہیے جس کے باب میں نمرود اور اس کی قوم سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ فرعون نہ صرف خدا کی ہستی کا منکر تھا بلکہ خود خدا ہونے کا مدعی تھا۔ یعنی اس کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ دنیا کے سامنے کھلم کھلا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں خالق ارض وسما ہوں، اور اس کی قوم اتنی پاگل تھی کہ اس کے دعوے پر ایمان لاتی تھی۔ حالانکہ قرآن اور تاریخ کی شہادت سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ الوہیت وربوبیت کے باب میں اس کی گمراہی نمرود کی گمراہی سے اور اس کی قوم کی گمراہی قومِ نمرود کی گمراہی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ فرق جو کچھ تھا وہ صرف اس بناء پر تھا کہ یہاں سیاسی اسباب سے بنی اسرائیل کے ساتھ ایک قوم پرستانہ ضد اور متعصّبانہ ہٹ دھرمی پیدا ہو گئی تھی اس لیے محض عناد کی بنا پر اللہ کو الٰہ اور رب ماننے سے انکار کیا جاتا تھا اگرچہ دلوں میں اس کا اعتراف چھپا ہوا تھا۔ جیسا کہ آج کل بھی اکثر دہریوں کا حال ہے۔

اصل واقعات یہ ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب مصریوں میں اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے اپنی پوری قوت اسلام کی تعلیم پھیلانے میں صرف کر دی اور سرزمین مصر پر اتنا گہرا نقش مرتسم کیا کہ صدیوں تک کسی کے مٹائے نہ مٹ سکا۔ اس وقت چاہے تمام اہل مصر نے دین حق قبول نہ کر لیا ہو۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ مصر میں کوئی شخص اللہ سے ناواقف رہ گیا ہو اور یہ نہ جان گیا ہو کہ وہی خالق ارض وسما ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کا کم سے کم اتنا اثر ہر مصری پر ضرور ہو گیا تھا کہ وہ فوق الفطری معنوں میں اللہ کو الٰہ الآلہ اور رب الارباب تسلیم کرتا تھا اور کوئی مصری اللہ کی الوہیت کا منکر نہ رہا تھا۔ البتہ جو ان میں کفر پر قائم رہ گئے تھے وہ الوہیت وربوبیت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ یہ اثرات حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت تک باقی تھے۔[1] چنانچہ اس کا صریح ثبوت وہ تقریر ہے جو فرعون کے دربار میں ایک قبطی سردار نے کی تھی۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے دربار کا یہ امیر جو مسلمان ہو چکا تھا مگر اپنا اسلام چھپائے تھا، بے قرار ہو کر بول اٹھا:

---

[1] اگر توراۃ کے تاریخی بیان پر اعتماد کیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصر کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ مسلمان ہو چکا تھا۔ توراۃ میں بنی اسرائیل کی جو مردم شماری درج کی گئی ہے اس کی رو سے وہ لوگ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تھے تقریباً ۲۰ لاکھ تھے۔ اور مصر کی آبادی اس زمانہ میں ایک کروڑ سے زیادہ نہ ہوگی۔ توراۃ میں ان سب لوگوں کو بنی اسرائیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کسی حساب سے یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ۱۲ بیٹوں کی اولاد ۵ سو سال کے اندر بڑھ کر ۲۰ لاکھ ہو گئی ہو۔ لہٰذا قیاس یہی چاہتا ہے کہ مصر کے لوگوں میں سے ایک بہت بڑی تعداد مسلمان ہو کر بنی اسرائیل میں شامل ہو گئی ہو گی اور ہجرت کے موقع پر ان مصری مسلمانوں نے بھی اسرائیلی مسلمانوں کا ساتھ دیا ہو گا، اس سے اس تبلیغی کام کا اندازہ ہو سکتا ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے خلفاء نے مصر میں کیا۔

اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَ قَدۡ جَآءَکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ وَ اِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡهِ کَذِبُهٗ ۚ وَ اِنۡ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبۡکُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ یَعِدُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ یٰقَوۡمِ لَکُمُ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ظٰهِرِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ فَمَنۡ یَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا ؕ ... یٰقَوۡمِ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ مِّثۡلَ یَوۡمِ الۡاَحۡزَابِ ﴿ۙ۳۰﴾ مِثۡلَ دَاۡبِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ؕ ... وَ لَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا هَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا ؕ ... وَ یٰقَوۡمِ مَا لِیۡۤ اَدۡعُوۡکُمۡ اِلَی النَّجٰوۃِ وَ تَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَی النَّارِ ﴿ؕ۴۱﴾ تَدۡعُوۡنَنِیۡ لِاَکۡفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشۡرِکَ بِهٖ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ ۫ وَّ اَنَا اَدۡعُوۡکُمۡ اِلَی الۡعَزِیۡزِ الۡغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ (المومن۲۸۔۴۲)

کیا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے سامنے کھلی کھلی نشانیاں لا یا ہے؟ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر ضرور پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جس انجام سے وہ تمہیں ڈرا رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر نازل ہو کے رہے گا۔ یقین جانو کہ اللہ کسی حد سے بڑھے ہوئے جھوٹے آدمی کو فلاح کا راستہ نہیں دکھاتا۔ اے برادرانِ قوم! آج تمہارے ہاتھ میں حکومت ہے، زمین میں تم غالب ہو، مگر کل اللہ کا عذاب ہم پر آ جائے تو کون ہماری مدد کرے گا؟......اے برادران قوم! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر وہ دن نہ آ جائے جو بڑی بڑی قوموں پر آ چکا ہے، اور وہی انجام تمہارا نہ ہو جو قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور بعد کی قوموں کا ہوا......اس سے پہلے یوسف (علیہ السلام) تمہارے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تو تم اس چیز کے متعلق شک میں پڑے رہے جسے وہ لائے تھے۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا کہ اللہ ان کے بعد کوئی رسول نہ بھیجے گا......اور اے برادران قوم! یہ عجیب معاملہ ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو تو تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراؤں جن کے شریک ہونے پر میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں ہے، اور میں تمہیں اس کی طرف بلاتا ہوں جو سب سے زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔

یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظیم الشان شخصیت کا اثر کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس وقت تک باقی تھا اور اس جلیل القدر نبی کی تعلیم سے متاثر ہونے کے باعث یہ قوم جہالت کے اس مرتبے پر نہ تھی کہ اللہ کی ہستی سے بالکل ہی ناواقف ہوتی یا یہ نہ جانتی کہ اللہ رب اور الٰہ ہے اور قوائے فطرت پر اس کا غلبہ وقہر قائم ہے اور اس کا غضب کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ اس کے آخری فقرے سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کی قطعی منکر نہ تھی بلکہ ان کی گمراہی وہی تھی جو دوسری قوموں کی بیان ہو چکی ہے یعنی ان دونوں حیثیتوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا۔

شبہ جس وجہ سے واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اِنَّا رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (ہم رب العلمین کے رسول ہیں) سن کر پوچھتا ہے وَمَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ (رب العلمین کیا چیز ہے؟) اپنے وزیر ہامان سے کہتا ہے کہ میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا کہ میں موسیٰ کے الٰہ کو دیکھوں۔ حضرت موسیٰ کو دھمکی دیتا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو تم نے الٰہ بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا۔ ملک بھر میں اعلان کرتا ہے کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔ اپنے درباروں سے کہتا ہے کہ میں اپنے سوا تمہارے کسی الٰہ کو نہیں جانتا۔ اس قسم کے فقرات دیکھ کر لوگوں کو گمان ہوا کہ شاید کہ وہ اللہ کی ہستی ہی کا منکر تھا، رب العلمین کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھا اور اپنے آپ ہی کو واحد معبود سمجھتا تھا۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہ تمام باتیں قوم پرستانہ ضد کی وجہ سے تھیں۔ حضرت یوسف کے زمانہ میں صرف یہی نہیں ہوا تھا کہ آنجناب کی زبردست شخصیت کے اثر سے اسلام کی تعلیمات مصر میں پھیل گئی تھیں، بلکہ حکومت میں جو اقتدار ان کو حاصل ہوا تھا ان کی بدولت بنی اسرائیل مصر میں بہت بااثر ہو گئے تھے۔ تین چار سو سال تک یہ اسرائیلی اقتدار مصر پر چھایا رہا۔ پھر وہاں اسرائیلیوں کے خلاف قوم پرستانہ جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے اقتدار کو الٹ پھینکا گیا اور ایک مصری قوم پرست خاندان فرماں روا ہو گیا۔ ان نئے فرماں رواؤں نے محض اسرائیلیوں کو دبانے اور کچلنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ دور یوسفی کے ایک ایک اثر کو مٹانے اور اپنے قدیم جاہلی مذہب کی روایات کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ اسی حالت میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو ان لوگوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں اقتدار پھر ہمارے ہاتھ سے نکل کر اسرائیلیوں کے ہاتھ میں نہ چلا جائے۔ یہی عناد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ تھا جس کی بنا پر فرعون چند را چندرا کر

Farooqi
2011

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھتا تھا کہ رب العلمین کیا ہوتا ہے؟ میرے سوا اور الٰہ کون ہوسکتا ہے؟ ورنہ دراصل وہ رب العلمین سے بے خبر نہ تھا۔ اس کی اور اس کے اہل دربار کی جو گفتگوئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جو تقریریں قرآن میں آئی ہیں، ان سب سے یہ حقیقت بین طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک موقع پر فرعون اپنی قوم کو یہ یقین دلانے کے لیے موسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر نہیں ہیں، کہتا ہے:

فَلَوْ لَآ اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَھَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ (الزخرف ۵۳)

تو کیوں نہ اس کے لیے سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتے صف بستہ ہو کر اس کے ساتھ کیوں نہ آئے؟

کیا یہ بات ایک ایسا شخص کہہ سکتا تھا جو اللہ اور ملائکہ کے تصور سے خالی الذہن ہوتا؟ ایک اور موقع پر فرعون اور حضرت موسیٰ کے درمیان یہ گفتگو ہوتی ہے:

. . . فَقَالَ لَہٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ ھٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ (بنی اسرائیل ۱۰۱۔ ۱۰۲)...... پس فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو سمجھتا کہ تیری عقل خبط ہو گئی ہے۔ موسیٰ نے جواب دیا تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں رب زمین و آسمان کے سوا کسی اور کی نازل کی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اے فرعون تیری شامت ہی آ گئی ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرعونیوں کی قلبی حالت اس طرح بیان فرماتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتْھُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَۃً قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۳﴾ وَ جَحَدُوْا بِھَا وَ اسْتَیْقَنَتْھَآ اَنْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ (النمل ۱۳۔ ۱۴)

جب ہماری نشانیاں ان کے سامنے علانیہ نمایاں ہوگئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ صریح جادو ہے۔ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انہوں نے محض شرارت اور تکبر و سرکشی کی بنا پر ماننے سے انکار کیا۔

ایک اور مجلس کا نقشہ قرآن یوں کھینچتا ہے:

قَالَ لَھُمْ مُّوْسٰی وَیْلَکُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا فَیُسْحِتَکُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰی ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا اِنْ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِھِمَا وَ یَذْھَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی ﴿۶۳﴾ (طٰہٰ ۶۱۔ ۶۳)

موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تم پر افسوس ہے۔ اللہ پر جھوٹ افتراء نہ باندھو ورنہ وہ سخت عذاب سے تمہیں تباہ کر دے گا اور افتراء جس نے بھی باندھا ہے وہ نامراد ہو کر ہی رہا ہے۔ یہ سن کر لوگ آپس میں رد و کد کرنے لگے اور خفیہ مشورہ ہوا جس میں کہنے والوں نے کہا یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) تو جادوگر ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہاری سرزمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی (آئیڈیل) طریق زندگی کو مٹا دیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور افتراء کے انجام سے خبردار کرنے پر ان کے درمیان رد و کد اسی لیے شروع ہوگئی تھی کہ ان لوگوں کے دلوں میں کہیں تھوڑا بہت اثر خدا کی عظمت اور اس کے خوف کا موجود تھا۔ لیکن جب ان کے قوم پرست حکمران طبقہ نے سیاسی انقلاب کا خطرہ پیش کیا، اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی بات ماننے کا انجام یہ ہوگا کہ مصریت پھر اسرائیلیت سے مغلوب ہوجائے گی تو ان کے دل پھر سخت ہو گئے اور سب نے بالاتفاق رسولوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ہم بآسانی یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان اصل جھگڑا کس بات پر تھا، فرعون اور اس کی قوم کی حقیقی گمراہی کس نوعیت کی تھی، اور فرعون کس معنی میں الوہیت و ربوبیت کا مدعی تھا۔ اس غرض کے لیے قرآن کی حسب ذیل آیات ترتیب وار ملاحظہ کیجیے۔

فرعون کے درباریوں میں سے جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا استحصال کرنے پر زور دیتے تھے وہ ایک موقع پر فرعون کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

اَتَذَرُ مُوْسٰی وَ قَوْمَہٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ یَذَرَکَ وَ اٰلِھَتَکَ ؕ (اعراف ۱۲۷)

کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائے اور آپ کے الٰھوں کو چھوڑ دے۔

دوسری طرف انہی درباریوں میں سے جو شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا وہ ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

تَدْعُوْنَنِیْ لِاَکْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ (المومن ۴۲)

تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان کو شریک کروں جن کے شریک ہونے کے لیے میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں۔

ان دونوں آیتوں کو جب ہم ان معلومات کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں جو تاریخ و آثارِ قدیمہ کے ذریعہ سے ہمیں اس زمانہ کے اہل مصر کے متعلق حاصل ہوئی ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فرعون خود بھی اور اس کی قوم کے لوگ بھی ربوبیت کے پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بعض دیوتاؤں کو خدائی میں شریک ٹھہراتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر فرعون فوق الفطری معنوں میں خدا ہونے کا مدعی ہوتا، یعنی اگر اس کا دعویٰ یہی ہوتا کہ سلسلۂ اسباب پر وہ خود حکمران ہے اور اس کے سوا زمین و آسمان کا الٰہ و رب کوئی نہیں ہے، تو وہ دوسرے الٰھوں کی پرستش نہ کرتا۔

۲۔ فرعون کے یہ الفاظ جو قرآن میں نقل کیے گئے ہیں کہ

یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ (القصص ۳۸)

لوگو! میں تو اپنے سوا کسی الٰہ کو جانتا نہیں ہوں۔

لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ (الشعرا ۲۹)

اے موسیٰ! اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

ان الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرعون اپنے سوا دوسرے تمام الٰھوں کی نفی کرتا تھا، بلکہ اس کی اصل غرض حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنا تھا۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے الٰہ کی طرف بلا رہے تھے جو صرف فوق الفطری معنی ہی میں معبود نہیں ہے بلکہ سیاسی و تمدنی معنی میں امر و نہی کا مالک اور اقتدارِ اعلیٰ کا حامل بھی ہے، اس لیے اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہارا ایسا الٰہ تو میرے سوا کوئی نہیں ہے، اور حضرت موسیٰ کو دھمکی دی کہ اس معنی میں میرے سوا کسی کو الٰہ بناؤ گے تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

نیز قرآن کی ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اور تاریخ و آثارِ قدیمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ فراعنۂ مصر محض حاکمیت مطلقہ ***(ABSOLUTSOVEREIGNTY)*** ہی کے مدعی نہ تھے بلکہ دیوتاؤں سے اپنا رشتہ جوڑ کر ایک طرح کی قدوسیت کا بھی دعویٰ رکھتے تھے تاکہ رعایا کے قلب و روح پر ان کی گرفت خوب مضبوط ہو جائے۔ اس معاملہ میں تنہا فراعنہ ہی منفرد نہیں ہیں، دنیا کے اکثر ملکوں میں شاہی خاندانوں نے سیاسی حاکمیت کے علاوہ فوق الفطری الوہیت و ربوبیت میں بھی کم و بیش حصہ بٹانے کی کوشش کی ہے اور رعیت کے لیے لازم کیا ہے کہ وہ ان کے آگے عبودیت کے کچھ نہ کچھ مراسم ادا کرے۔ لیکن دراصل یہ محض ایک ضمنی چیز ہے۔ اصل مقصد سیاسی حاکمیت کا استحکام ہوتا ہے اور اس کے لیے فوق الفطری الوہیت کا دعویٰ محض ایک تدبیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مصر میں اور دوسرے جاہلیت پرست ملکوں میں بھی ہمیشہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی شاہی خاندانوں کی الوہیت بھی ختم ہوتی رہی ہے۔ اور تخت جس جس کے پاس گیا ہے الوہیت بھی اسی کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی ہے۔

۳۔ فرعون کا اصلی دعویٰ فوق الفطری خدائی کا نہیں بلکہ سیاسی خدائی کا تھا۔ وہ ربوبیت کے تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی کے لحاظ سے کہتا تھا کہ میں سر زمین مصر اور اس کے باشندوں کا رب اعلیٰ (Over Lord) ہوں۔ اس ملک اور اس کے تمام وسائل و ذرائع کا مالک میں ہوں۔ یہاں کی حاکمیت مطلقہ کا حق مجھ ہی کو پہنچتا ہے یہاں کے تمدن و اجتماع کی اساس میری ہی مرکزی شخصیت ہے۔ یہاں قانون میرے سوا کسی اور کا نہ چلے گا۔ قرآن کے الفاظ میں اس کے دعویٰ کی بنیاد یہ تھی۔

وَ نَادٰی فِرۡعَوۡنُ فِیۡ قَوۡمِہٖ قَالَ یٰقَوۡمِ اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَ ہٰذِہِ الۡاَنۡہٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۵۱﴾ (الزخرف ۵۱)

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی کہ اے قوم! کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں؟ اور یہ نہریں میرے ماتحت نہیں چل رہی ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

یہ وہی بنیاد تھی جس پر نمرود کا دعوائے ربوبیت مبنی تھا (حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ) اور اسی بنیاد پر حضرت یوسف علیہ السلام کا ہم عصر بادشاہ بھی اپنے اہل ملک کا رب بنا ہوا تھا۔

۴۔ حضرت موسیٰ کی دعوت جس پر فرعون اور آلِ فرعون سے ان کا جھگڑا تھا، دراصل یہ تھی کہ رب العٰلمین کے سوا کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا الٰہ اور رب نہیں ہے۔ وہی تنہا فوق الفطری معنی میں بھی الٰہ اور رب ہے، اور سیاسی و اجتماعی معنی میں بھی۔ پرستش بھی اسی کی ہو، بندگی و اطاعت بھی اسی کی، اور پیروی قانون بھی اسی کی۔ نیز یہ کہ صریح نشانیوں کے ساتھ اس نے مجھے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے، میرے ذریعہ سے وہ اپنے امر و نہی کے احکام دے گا، لہٰذا اس کے بندوں کی عنانِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں نہیں، میرے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اسی بنا پر فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت بار بار کہتے تھے کہ یہ دونوں بھائی ہمیں زمین سے بے دخل کر کے خود قابض ہونا چاہتے ہیں اور ہمارے ملک کے نظامِ مذہب و تمدن کو مٹا کر اپنا نظام قائم کرنے کے در پے ہیں۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَ سُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۙ۹۶﴾ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ فَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ فِرۡعَوۡنَ ۚ وَ مَاۤ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِیۡدٍ ﴿۹۷﴾ (ھود ۹۷)

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور صریح نشانِ ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے سردارانِ قوم کی طرف بھیجا تھا، مگر ان لوگوں نے فرعون کے امر کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کا امر راستی پر نہ تھا۔

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا قَبۡلَہُمۡ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ وَ جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌ کَرِیۡمٌ ﴿ۙ۱۷﴾ اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿ۙ۱۸﴾ وَّ اَنۡ لَّا تَعۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ ۚ اِنِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ۚ۱۹﴾ (الدخان ۱۷۔۱۹)

اور ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ ایک معزز رسول ان کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو۔ میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں اور اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو میں تمہارے سامنے صریح نشانِ ماموریت پیش کرتا ہوں۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿ؕ۱۵﴾ فَعَصٰی فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰہُ اَخۡذًا وَّبِیۡلًا ﴿۱۶﴾ (المزمل ۱۵۔۱۶)

(اے اہل مکہ!) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہی دینے والا ہے، اسی طرح جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پھر فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سختی کے ساتھ پکڑا۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰہٰ ۴۹۔۵۰)

فرعون نے کہا اے موسیٰ (اگر تم نہ دیوتاؤں کو رب مانتے ہو نہ شاہی خاندان کو) تو آخر تمہارا رب کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا، ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص ساخت عطا کی پھر اسے اس کے کام کرنے کا طریقہ بتایا۔

قَالَ فِرۡعَوۡنُ وَ مَا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ؕ۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنۡ حَوۡلَہٗۤ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّکُمۡ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوۡلَکُمُ الَّذِیۡۤ اُرۡسِلَ اِلَیۡکُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذۡتَ اِلٰـہًا غَیۡرِیۡ لَاَجۡعَلَنَّکَ مِنَ الۡمَسۡجُوۡنِیۡنَ ﴿۲۹﴾ (الشعراء ۲۳۔۲۹)

فرعون نے کہا اور یہ رب العٰلمین کیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا زمین و آسمان اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ فرعون اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے بولا، سنتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب بھی۔ فرعون بولا

تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا مشرق اور مغرب اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ اس پر فرعون بول اٹھا کہ اگر میرے سوا تو نے کسی اور کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ (طٰہٰ ۵۷)

فرعون نے کہا اے موسیٰ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ (المؤمن ۲۶)

اور فرعون نے کہا چھوڑو مجھے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دوں اور وہ اپنے رب کو مدد کے لیے پکار دیکھے۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ (طٰہٰ ۶۳)

انہوں نے کہا کہ یہ دونوں تو جادوگر ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کریں اور تمہارے مثالی طریق زندگی کو مٹا دیں۔

ان تمام آیات کو ترتیب وار دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ربوبیت کے باب میں وہی ایک گمراہی جو ابتدا سے دنیا کی مختلف قوموں میں چلی آ رہی تھی ارضِ نیل میں بھی ساری ظلمت اسی کی تھی اور وہی ایک دعوت جو ابتدا سے تمام انبیاء دیتے چلے آ رہے تھے، موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اسی کی طرف بلاتے تھے۔

یہود و نصاریٰ

قومِ فرعون کے بعد ہمارے سامنے بنی اسرائیل اور وہ دوسری قومیں آتی ہیں جنہوں نے یہودیت اور عیسائیت اختیار کی۔ ان کے متعلق یہ تو گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر ہوں گے یا اس کو الٰہ اور رب نہ مانتے ہوں گے۔ اس لیے کہ خود قرآن نے ان کے اہل کتاب ہونے کی تصدیق کی ہے پھر سوال یہ ہے کہ ربوبیت کے باب میں ان کے عقیدے اور طرزِ عمل کی وہ کون سی خاص غلطی ہے جس کی بنا پر قرآن نے ان لوگوں کو گمراہ قرار دیا ہے؟ اس کا مجمل جواب خود قرآن ہی سے ہمیں ملتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَاۗءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ (المائدہ ۷۷)

کہو اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، اور ان قوموں کے فاسد خیالات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکی ہیں، جنہوں نے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کیا اور خود بھی راہِ راست سے بھٹک گئیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی قوموں کی گمراہی بھی اصلاً اسی نوعیت کی ہے جس میں ان سے پہلے کی قومیں ابتدا سے مبتلا ہوتی چلی آئی ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ یہ گمراہی ان کے اندر غلو فی الدین کے راستہ سے آئی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس اجمال کی تفصیل قرآن کس طرح کرتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ (التوبہ ۳۰)

یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ (المائدہ ۷۲)

کفر کیا ان عیسائیوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ (مائدہ ۷۳)

کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ ایک الٰہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ ہے ہی نہیں۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰــهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ (مائدہ ۱۱۶)

اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی الٰہ بنالو، تو وہ جواب میں عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری کیا مجال تھی کہ میں وہ بات کہتا کہ جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہ تھا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران ۷۹-۸۰)

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (خدا پرست) بنو۔ جس طرح تم خدا کی کتاب میں پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے درس دیا کرتے ہو۔ اور نہ نبی کا یہ کام ہے کہ وہ تم کو یہ حکم دے کہ ملائکہ اور پیغمبروں کو رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں کفر کی تعلیم دے گا جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

ان آیات کی رو سے اہل کتاب کی پہلی گمراہی یہ تھی کہ جو بزرگ ہستیاں ...... انبیاء، اولیاء، ملائکہ وغیرہ ...... دینی حیثیت سے قدر و منزلت کی مستحق تھیں، ان کو انہوں نے ان کے حقیقی مرتبہ سے بڑھا کر خدائی کے مرتبہ میں پہنچا دیا، کاروبارِ خداوندی میں انہیں دخیل و شریک ٹھہرایا، ان کی پرستش کی، ان سے دعائیں مانگیں۔ انہوں فوق الفطری ربوبیت والوہیت میں حصہ دار سمجھا، اور یہ گمان کیا کہ وہ بخشش اور مددگاری اور نگہبانی کے اختیار رکھتی ہیں۔

اس کے بعد ان کی دوسری گمراہی یہ تھی کہ:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ ۳۱)

انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو بھی اپنا رب بنالیا۔

یعنی نظامِ دینی میں جن لوگوں کی حیثیت صرف یہ تھی کہ خدا کی شریعت کے احکام بتائیں اور خدا کی مرضی کے مطابق اخلاق کی اصلاح کریں، انہیں رفتہ رفتہ یہ حیثیت دے دی کہ باختیارِ خود جس چیز کو چاہیں حرام اور جسے چاہیں حلال ٹھہرا دیں اور کتاب الٰہی کی سند کے بغیر جو حکم چاہیں دیں، جس چیز سے چاہیں منع کر دیں اور جو سنت چاہیں جاری کریں۔ اس طرح یہ لوگ انہی دو عظیم الشان بنیادی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے جن میں قومِ نوح، قوم ابراہیم، عاد، ثمود، اہل مدین اور دوسری قومیں مبتلا ہوئی تھیں۔ ان کی طرح انہوں نے بھی فوق الطبیعی ربوبیت میں فرشتوں اور بزرگوں کو اللہ کا شریک بنایا۔ اور انہی کی طرح انہوں نے تمدنی و سیاسی ربوبیت اللہ کے بجائے انسانوں کو دی اور اپنے تمدن، معاشرت، اخلاق اور سیاست کے اصول و احکام اللہ کی سند سے بے نیاز ہو کر انسانوں سے لینے شروع کر دیے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (النساء ۵۱)

تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب اللہ کا ایک حصہ ملا ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مان رہے ہیں۔

قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ‌ؕ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ۞ (المائدة ۶۰)

کہو! میں تمہیں بتاؤں اللہ کے نزدیک فاسقین سے بھی زیادہ بدتر انجام کس کا ہے؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب ٹوٹا، جن میں بہت سے لوگ اس کے حکم سے بندر اور سؤر تک بنائے گئے اور انہوں نے طاغوت کی بندگی کی، وہ سب سے بدتر درجہ کے لوگ ہیں اور راہِ راست سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

''جبت'' کا لفظ تمام اوہام وخرافات کے لیے جامع لفظ ہے جس میں جادو، ٹونے، ٹوٹکے، کہانت، فال گیری، سعد ونحس کے تصورات، غیر فطری تاثیرات، غرض جملہ اقسام کے توہمات شامل ہیں۔ اور ''طاغوت'' سے مراد ہر وہ شخص یا گروہ یا ادارہ ہے جس نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کی ہو، اور بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خداوندی کا علم بلند کیا ہو۔ پس یہود ونصاریٰ جب سے مذکورہ بالا دو قسم کی گمراہیوں میں پڑ گئے تو پہلی قسم کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہر قسم کے توہمات نے ان کے دلوں اور دماغوں پر قبضہ کر لیا، اور دوسری گمراہی نے ان کو علماء مشائخ اور زہاد وصوفیہ کی بندگی سے بڑھا کر ان جباروں اور ظالموں کی بندگی و اطاعت تک پہنچا دیا جو کھلم کھلا خدا سے باغی تھے۔

مشرکین عرب:

اب دیکھنا چاہیے کہ وہ عرب کے مشرکین جن کی طرف نبی ﷺ مبعوث ہوئے، اور جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے، اس باب میں ان کی گمراہی کس نوعیت کی تھی۔ کیا وہ اللہ سے ناواقف تھے یا اس کی ہستی کے منکر تھے اور نبی ﷺ اس لیے بھیجے گئے تھے کہ انہیں وجودِ باری کا معترف بنائیں؟ کیا وہ اللہ کو الٰہ اور رب نہیں مانتے تھے اور قرآن اس لیے نازل ہوا تھا کہ انہیں حق جل شانہٗ کی الٰہیت و ربوبیت کا قائل کرے؟ کیا انہیں اللہ کی عبادت و پرستش سے انکار تھا؟ یا وہ اللہ کو دعائیں سننے والا اور حاجتیں پوری کرنے والا نہیں سمجھتے تھے؟ کیا ان کا خیال یہ تھا کہ لات اور منات اور عزیٰ اور ہبل اور دوسرے معبود ہی اصل میں کائنات کے خالق، مالک، رازق اور مدبر ومنتظم ہیں؟ یا وہ اپنے ان معبودوں کو قانون کا منبع اور اخلاق وتمدن کے مسائل میں ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ مانتے تھے؟ ان میں سے ایک ایک سوال کا جواب ہم کو قرآن سے نفی کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ عرب کے مشرکین نہ صرف یہ کہ اللہ کی ہستی کے قائل تھے، بلکہ اسے تمام کائنات کا اور خود اپنے معبودوں تک کا خالق، مالک اور خداوندِ اعلیٰ مانتے تھے اس کو رب اور الٰہ تسلیم کرتے تھے۔ مشکلات اور مصائب میں آخری اپیل وہ جس سرکار میں کرتے تھے وہ اللہ ہی کی سرکار تھی۔ انہیں اللہ کی عبادت و پرستش سے بھی انکار نہ تھا۔ ان کا عقیدہ اپنے دیوتاؤں اور معبودوں کے بارے میں نہ تو یہ تھا کہ وہ ان کے اور کائنات کے خالق ورازق ہیں اور نہ یہ کہ یہ معبود زندگی کے تمدنی واخلاقی مسائل میں ہدایت ورہنمائی کرتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی آیات اس پر شاہد ہیں:

قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهَآ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۞ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ‌ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ۞ قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَرَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ۞ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ‌ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۞ قُلۡ مَنۡۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُوَ يُجِيۡرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۞ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ‌ ؕ قُلۡ فَاَنّٰى تُسۡحَرُوۡنَ ۞ بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِالۡحَـقِّ وَاِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ ۞ (المومنون ۸۴-۹۰)

اے نبی ان سے کہو، زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کی ملک ہے؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی ملک ہے۔ کہو پھر بھی تم نصیحت قبول نہیں کرتے۔ کہو، ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ وہ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر بھی تم نہیں ڈرتے؟ کہو ہر چیز کے شاہانہ اختیارات کس کے ہاتھ میں ہیں؟ اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں پناہ دینے کی طاقت کسی میں نہیں بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے یہ صفت اللہ ہی کی ہے۔ کہو پھر کہاں سے تم کو دھوکا لگتا ہے؟ حق یہ ہے کہ ہم نے صداقت ان کے سامنے پیش کر دی ہے اور یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

هُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُکُمۡ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡکِ ۚ وَ جَرَیۡنَ بِہِمۡ بِرِیۡحٍ طَیِّبَۃٍ وَّ فَرِحُوۡا بِہَا جَآءَتۡہَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَہُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ اُحِیۡطَ بِہِمۡ ۙ دَعَوُا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ۚ لَئِنۡ اَنۡجَیۡتَنَا مِنۡ ہٰذِہٖ لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡجٰہُمۡ اِذَا ہُمۡ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ (یونس ۲۲۔۲۳)

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے حتیٰ کہ جس وقت تم کشتی میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکا یک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور تم سمجھتے ہو کہ طوفان میں گھر گئے اس وقت سب اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور اسی کے لیے اپنے دین کو خالص کر کے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے اس بلا سے ہم کو بچا لیا تو ہم تیرے شکر گذار بندے بنیں گے، مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔

وَ اِذَا مَسَّکُمُ الضُّرُّ فِی الۡبَحۡرِ ضَلَّ مَنۡ تَدۡعُوۡنَ اِلَّاۤ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىکُمۡ اِلَی الۡبَرِّ اَعۡرَضۡتُمۡ ؕ وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ کَفُوۡرًا ﴿۶۷﴾ (بنی اسرائیل ۶۷)

جب سمندر میں تم پر کوئی آفت آتی ہے تو اس ایک رب کے سوا اور جن جن کو تم پکارتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے پھر جاتے ہو۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔

اپنے معبودوں کے متعلق ان کے جو خیالات تھے وہ خود انہی کے الفاظ میں قرآن اس طرح نقل کرتا ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی ؕ (الزمر ۳)

جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے ولی اور کارساز ٹھہرا رکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کر دیں۔

وَ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ (یونس ۱۸)

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور میں ہمارے سفارشی ہیں۔

پھر وہ اپنے معبودوں کے بارے میں اس قسم کا بھی کوئی گمان نہ رکھتے تھے کہ وہ مسائل زندگی میں ہدایت بخشنے والے ہیں۔ چنانچہ سورۂ یونس میں اللہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ

قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ ؕ (یونس ۳۵)

ان سے پوچھو، تمہارے ٹھہرائے ہوئے ان شریکوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔

لیکن یہ سوال سن کر ان پر سکوت چھا جاتا ہے ان میں سے کوئی یہ جواب نہیں دیتا کہ ہاں لات یا منات یا عزیٰ یا دوسرے معبود ہمیں فکر و عمل کی صحیح راہیں بتاتے ہیں اور وہ دنیا کی زندگی میں عدل اور سلامتی اور امن کے اصول ہمیں سکھاتے ہیں اور ان کے سرچشمہ علم سے ہم کو کائنات کے بنیادی حقائق کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ تب اللہ اپنے نبی سے فرماتا ہے:

قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ مَّنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰہُ یَہۡدِیۡ لِلۡحَقِّ ؕ اَفَمَنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ اَحَقُّ اَنۡ یُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا یَہِدِّیۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّہۡدٰی ۚ فَمَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ (یونس)

کہو، مگر اللہ حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پھر بتاؤ کون اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے؟ وہ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یا وہ جو خود ہدایت نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے فیصلے کر رہے ہو؟

ان تصریحات کے بعد اب یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ ربوبیت کے باب میں ان کی وہ اصل گمراہی کیا تھی جن کی اصلاح کرنے کے لیے اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا اور کتاب نازل کی؟ اس سوال کی تحقیق کے لیے جب ہم قرآن میں نظر کرتے ہیں تو ان کے عقائد و اعمال میں بھی ہم کو انہی دو بنیادی گمراہیوں کا سراغ ملتا ہے جو قدیم سے تمام گمراہ قوموں میں پائی جاتی رہی ہیں، یعنی:

ایک طرف فوق الطبیعی ربوبیت والٰہیت میں وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہوں اور ارباب کو شریک ٹھہراتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ سلسلۂ اسباب پر جو حکومت کار فرما ہے اس کے اختیارات و اقتدارات میں کسی نہ کسی طور پر ملائکہ اور بزرگ انسان اور اجرامِ فلکی وغیرہ بھی دخل رکھتے ہیں اسی بنا پر دعا اور استعانت اور مراسم عبودیت میں وہ صرف اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ ان بناوٹی خداؤں کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے۔

دوسری طرف تمدنی وسیاسی ربوبیت کے باب میں ان کا ذہن اس تصور سے بالکل خالی تھا کہ اللہ اس معنی میں بھی رب ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے مذہبی پیشواؤں، اپنے سرداروں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کو رب بنائے ہوئے تھے اور انہی سے اپنی زندگی کے قوانین لیتے تھے۔

چنانچہ پہلی گمراہی کے متعلق قرآن یہ شہادت دیتا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۱﴾ یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهٗ وَ مَا لَا یَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ﴿۱۲﴾ یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَ لَبِئْسَ الْعَشِیْرُ ﴿۱۳﴾ (الحج ۱۱۔۱۳)

انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو خدا پرستی کی سرحد پر کھڑا ہو کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ فائدہ ہوا تو مطمئن ہو گیا۔ اور جو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو الٹا پھر گیا۔ یہ شخص دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ اٹھانے والا ہے۔ وہ اللہ سے پھر کر ان کو پکارنے لگتا ہے جو نہ اسے نقصان پہنچاتے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ فائدہ پہنچانے کی۔ یہی بڑی گمراہی ہے۔ وہ مدد کے لیے ان کو پکارتا ہے جنہیں پکارنے کا نقصان بہ نسبت نفع کے زیادہ قریب ہے کیسا برا مولیٰ ہے اور کیسا برا ساتھی ہے۔

وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ (یونس ۱۸)

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں، کہو (اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جو اس کے علم میں نہ آسمانوں میں ہے نہ زمین میں؟! اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ (حم السجدۃ ۹)

اے نبی! ان سے کہو، کیا واقعی تم اس خدا سے جس نے دو دن میں زمین کو پیدا کر دیا کفر کرتے ہو اور دوسرے کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۷۶﴾ (المائدہ ۷۶)

کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے لیے نقصان کا کچھ اختیار رکھتے ہیں نہ فائدے کا؟ حالانکہ سننے اور جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ (الزمر ۸)

اور جب انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو یکسو ہو کر اپنے رب ہی کو پکارتا ہے، مگر جب وہ اپنی نعمت سے اس کو سرفراز کرتا ہے تو یہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس میں مدد کے لیے اس سے پہلے اللہ کو پکار رہا تھا اور اللہ کے ہمسر ٹھہرانے لگتا ہے [1] تا کہ یہ حرکت اسے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے۔

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ یَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾ (النمل ۵۳-۵۶)

تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ کی بخشش سے حاصل ہے۔ جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اللہ ہی کی طرف فریاد لے کر تم جاتے ہو، مگر جب وہ اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو (اس مشکل کشائی میں) دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہیں تا کہ ہمارے احسان کا جواب احسان فراموشی سے دیں۔ اچھا مزے کر لو۔ عنقریب تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔ یہ لوگ جن کو نہیں جانتے ان کے لیے ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے حصے [2] مقرر کرتے ہیں۔ خدا کی قسم جو افتراء پردازیاں تم کرتے ہو ان کی باز پرس تم سے ہو کر رہے گی۔

رہی دوسری گمراہی تو اس کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے:

وَ كَذٰلِكَ زَیَّنَ لِكَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِیُرْدُوْهُمْ وَ لِیَلْبِسُوْا عَلَیْهِمْ دِیْنَهُمْ ؕ (انعام ۱۳۷)

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے بنائے ہوئے شریکوں نے اپنی اولاد کا قتل پسندیدہ بنا دیا تا کہ انہیں ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان کے دین کے لیے مشتبہ بنا دیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں ''شریکوں'' سے مراد بت اور دیوتا نہیں ہیں بلکہ وہ پیشوا اور رہنما ہیں جنہوں نے قتل اولاد کو اہل عرب کی نگاہ میں ایک بھلائی اور خوبی کا کام بنایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام کے دین میں اس رسم قبیح کی آمیزش کر دی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ خدا کے ''شریک'' اس معنی میں قرار نہیں دیے گئے تھے کہ اہل عرب ان کو سلسلۂ اسباب پر حکمران سمجھتے تھے یا ان کی پرستش کرتے اور ان سے دعائیں مانگتے تھے، بلکہ ان کو ربوبیت و الٰہیت میں شریک اس لحاظ سے ٹھہرایا گیا تھا کہ اہل عرب ان کے اس حق کو تسلیم کرتے تھے کہ تمدنی و معاشرتی مسائل اور اخلاقی و مذہبی امور میں وہ جیسے چاہیں قوانین مقرر کر دیں۔

---

[1] اللہ کے ہمسر ٹھہرانے لگتا ہے یعنی یہ کہنے لگتا ہے کہ یہ مصیبت فلاں بزرگ کی برکت سے ٹلی اور یہ نعمت فلاں حضرت کی عنایت سے نصیب ہوئی۔

[2] یعنی جن کے متعلق انہیں ہرگز کسی ذریعہ علم سے یہ تحقیق نہیں ہوا ہے کہ مصیبت کے ٹالنے والے اور مشکل کو آسان کرنے والے وہ تھے، ان کے لیے شکرانے کے طور پر چڑھاوے اور نذریں اور نیازیں نکالتے ہیں اور لطف یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق سے نکالتے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ (الشوریٰ ۲۱)

کیا یہ ایسے شریک بنائے بیٹھے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کی قسم سے وہ قانون بنا دیا جس کا اللہ نے کوئی اذن نہیں دیا ہے۔

لفظ ''دین'' کی تشریح آگے چل کر بیان ہوگی اور وہیں اس آیت کے مفہوم کی وسعت بھی پوری طرح واضح ہو سکے گی، لیکن یہاں کم از کم یہ بات تو صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر ان کے پیشواؤں اور سرداروں کا ایسے ضابطے اور قاعدے مقرر کرنا جو ''دین'' کی نوعیت رکھتے ہوں اور اہل عرب کا ان ضابطوں اور قاعدوں کو واجب التقلید مان لینا یہی ربوبیت والٰہیت میں ان کا خدا کے ساتھ شریک بننا اور یہی اہل عرب کا ان کی شرکت کو تسلیم کر لینا تھا۔

قرآن کی دعوت:

گمراہ قوموں کے تخیلات کی یہ تحقیق جو پچھلے صفحات میں کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہے کہ قدیم ترین زمانہ سے لے کر زمانۂ نزولِ قرآن تک جتنی قوموں کا ذکر قرآن نے ظالم، فاسد العقیدہ اور بدراہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہے، ان میں سے کوئی بھی خدا کی ہستی کی منکر نہ تھی، نہ کسی کو اللہ کے مطلقاً رب اور الٰہ ہونے سے انکار تھا، البتہ ان سب کی اصل گمراہی اور مشترک گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے ربوبیت کے ان پانچ مفہومات کو جو ہم ابتدا میں لغت اور قرآن کی شہادتوں سے متعین کر چکے ہیں، دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

رب کا یہ مفہوم کہ وہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش، خبرگیری، حاجت روائی اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے، ان کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا، اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ رب اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے، مگر اس کے ساتھ فرشتوں اور دیوتاؤں کو، جنوں کو، غیر مرئی قوتوں کو، ستاروں اور سیاروں کو، انبیاء اور اولیا اور روحانی پیشواؤں کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھہراتے تھے۔

اور رب کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار، اقتدارِ اعلیٰ کا مالک، ہدایت و رہنمائی کا منبع، قانون کا ماخذ، مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے، ان کے نزدیک بالکل ہی ایک دوسری حیثیت رکھتا تھا، اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے صرف انسانوں ہی کو رب مانتے تھے یا نظریے کی حد تک اللہ کو رب ماننے کے بعد عملاً انسانوں کی اخلاقی و تمدنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سر اطاعت خم کیے دیتے تھے۔

اسی گمراہی کو دور کرنے کے لیے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں اور اسی کے لیے آخر کار محمد ﷺ کی بعثت ہوئی۔ ان سب کی دعوت یہ تھی کہ ان تمام مفہومات کے اعتبار سے رب ایک ہی ہے اور وہ اللہ جل شانہ ہے۔ ربوبیت ناقابل تقسیم ہے۔ اس کا کوئی جزء کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ کائنات کا نظام ایک کامل مرکزی نظام ہے جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا۔ جس پر ایک خدا فرماں روائی کر رہا ہے، جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ہی خدا ہے۔ نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کچھ دخل ہے، نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے، اور نہ اس کی فرماں روائی میں کوئی حصہ دار ہے۔ مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری رب بھی ہے اور اخلاقی و تمدنی اور سیاسی رب بھی۔ وہی تمہارا معبود ہے۔ وہی تمہارا سجدوں اور رکوعوں کا مرجع ہے۔ وہی تمہاری دعاؤں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ وہی تمہارے توکل و اعتماد کا سہارا ہے۔ وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل ہے اور اسی طرح وہی بادشاہ ہے۔ وہی مالک الملک ہے۔ وہی شارع و قانون ساز اور امر و نہی کا مختار بھی ہے۔ ربوبیت کی یہ دونوں حیثیتیں جن کو جاہلیت کی وجہ سے تم نے ایک دوسرے سے الگ ٹھہرا لیا ہے، حقیقت میں خدائی لازمہ اور خدا کے خدا ہونے کا خاصہ ہیں۔ انہیں نہ ایک دوسرے سے منفک کیا جا سکتا ہے، اور نہ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی مخلوقات کو خدا کا شریک ٹھہرانا درست ہے۔

اس دعوت کو قرآن جس طریقہ سے پیش کرتا ہے وہ خود اسی کی زبان سے سنیے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۵۴ (الاعراف ۵۴)

حقیقت میں تمہارا رب تو اللہ ہے جس نے آسمان وزمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہو گیا، جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے، سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں۔ سنو! خلق اسی کی ہے اور فرماں روائی بھی اسی کی۔ بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۱ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲ (یونس ۳۱۔۳۲)

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے؟ کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی کس کے قبضہ واختیار میں ہے؟ کون ہے جو بے جان کو جاندار میں سے اور جاندار کو بے جان میں سے نکالتا ہے؟ اور کون اس کارگاہِ عالم کا انتظام چلا رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو، پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ جب یہ سارے کام اسی کے ہیں تو تمہارا حقیقی رب اللہ ہی ہے۔ حقیقت کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟ آخر کہاں سے تمہیں یہ ٹھوکر لگتی ہے کہ حقیقت سے پھرے جاتے ہو؟

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶ (الزمر ۵۔۶)

اس نے زمین وآسمان کو برحق پیدا کیا ہے۔ رات کو دن پر اور دن کو رات پر وہی لپیٹتا ہے۔ چاند اور سورج کو اسی نے ایسے ضابطے کا پابند بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلے جا رہا ہے...... یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ آخر یہ تم کہاں سے ٹھوکر کھا کر پھیرے جاتے ہو؟

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ ... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۶۲ ... اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۴ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ (المومن ۶۱۔۶۵)

اللہ جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں تم سکون حاصل کرو۔ اور دن کو روشن کیا...... وہی تمہارا اللہ تمہارا رب ہے، ہر چیز کا خالق، کوئی اور معبود اس کے سوا نہیں، پھر یہ کہاں سے دھوکا کھا کر تم بھٹک جاتے ہو؟...... اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا، آسمان کی چھت تم پر چھائی، تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں، اور تمہاری غذا کے لیے پاکیزہ چیزیں مہیا کیں، وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بڑا بابرکت ہے وہ کائنات کا رب۔ وہی زندہ ہے۔ کوئی اور معبود اس کے سوا نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ... يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۫ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝۱۳ؕ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ (فاطر ۱۳۔۱۴)

اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا...... وہ رات کو دن میں پردہ دیتا ہے اور دن کو رات میں، اس نے چاند اور سورج کو ایسے ضابطہ کا پابند بنایا ہے کہ ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلے جا رہا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا جن دوسری ہستیوں کو تم پکارتے ہو ان کے ہاتھ میں ایک ذرّہ کا اختیار بھی نہیں ہے۔ تم پکارو تو وہ تمہاری پکاریں سن نہیں سکتے، اور سن بھی لیں تو تمہاری درخواست کا جواب دینا ان کے بس میں نہیں۔

تم جوانہیں شریک خدا بناتے ہو اس کی تردید وہ خود قیامت کے دن کر دیں گے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ ... ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ ... فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ (الروم ۲۶۔۳۰)

آسمانوں کے رہنے والے ہوں یا زمین کے، سب اس کے غلام اور اس کے تابع فرمان ہیں...... اللہ خود تمہاری اپنی ذات سے ایک مثال تمہارے سامنے بیان کرتا ہے۔ کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی ان چیزوں کی ملکیت میں تمہارا شریک ہوتا ہے جو ہم نے تمہیں بخشی ہیں؟ کیا ان چیزوں کے اختیارات و تصرفات میں تم اور تمہارے غلام مساوی ہوتے ہیں؟ کیا تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنے برابر والوں سے ڈرا کرتے ہو؟ جو لوگ عقل سے کام لینے والے ہیں ان کے لیے تو ہم حقیقت تک پہنچا دینے والی دلیلیں اس طرح کھول کر بیان کر دیتے ہیں مگر ظالم لوگ علم کے بغیر اپنے بے بنیاد خیالات کے پیچھے چلے جا رہے ہیں...... لہٰذا تم بالکل یکسو ہو کر حقیقی دین کے راستہ پر اپنے آپ کو ثابت قدم کر دو اللہ کی فطرت پر قائم ہو جاؤ۔ جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت کو بدلا نہ جائے۔ یہی ٹھیک سیدھا طریقہ ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾ (الزمر ۶۷)

ان لوگوں نے اللہ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ جیسا کہ کرنا چاہیے تھا، نہیں کیا۔ قیامت کے روز یہ دیکھیں گے کہ زمین پوری کی پوری اس کی مٹھی میں ہے اور آسمان اس کے ہاتھ میں سمٹے ہوئے ہیں۔ اس کی ذات منزہ اور بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا شریک ہو، جیسا کہ یہ لوگ قرار دے رہے ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ (جاثیہ ۳۷)

پس ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین و آسمان اور تمام کائنات کا رب ہے۔ کبریائی اسی کی ہے۔ آسمانوں میں اور زمین میں بھی۔ اور وہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فَاعۡبُدۡہُ وَ اصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ ؕ ہَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ﴿٪۶۵﴾ (مریم ۶۵)

وہ زمین اور آسمانوں کا مالک اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں۔لہٰذا تو اسی کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ثابت قدم رہ۔کیا اس جیسا کوئی اور تیرے علم میں ہے؟

وَ لِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ فَاعۡبُدۡہُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ ؕ (ھود ۱۲۳)

زمین اور آسمانوں کی ساری پوشیدہ حقیقتیں اللہ کے علم میں ہیں اور سارے معاملات اسی کی سرکار میں پیش ہوتے ہیں۔لہٰذا تو اسی کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ کر۔

رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَاتَّخِذۡہُ وَکِیۡلًا ﴿۹﴾ (المزمل ۹)

مشرق اور مغرب سب کا وہی مالک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔لہٰذا تو اسی کو اپنا مختار کار بنالے۔

اِنَّ ہٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۹۲﴾ وَ تَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَہُمۡ بَیۡنَہُمۡ ؕ کُلٌّ اِلَیۡنَا رٰجِعُوۡنَ ﴿٪۹۳﴾ (انبیا ۹۲۔۹۳)

حقیت میں تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے۔اور میں تمہارا رب ہوں۔لہٰذا تم میری ہی بندگی کرو۔لوگوں نے اس کارِ ربوبیت اور اس معاملۂ بندگی کو آپس میں خود ہی تقسیم کرلیا ہے مگر ان سب کو بہرحال ہماری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ (اعراف ۳)

پیروی کرو اس کتاب کی جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی پیروی نہ کر۔

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ (آل عمران ۶۴)

کہو، اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم نہ تو اللہ کے سوا کسی کی بندگی کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیں اور نہ ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائے۔

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ (الناس)

کہو میں پناہ ڈھونڈتا ہوں اس کی جو انسانوں کا رب، انسانوں کا بادشاہ اور انسانوں کا معبود ہے۔

فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (کھف ۱۱۰)

پس جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی اور کی بندگی شریک نہ کرے۔

ان آیات کو سلسلہ وار پڑھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ قرآن ربوبیت کو بالکل حاکمیت اور سلطانی (*SOVEREIGNTY*) کا ہم معنی قرار دیتا ہے اور ''رب'' کا یہ تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ کائنات کا سلطانِ مطلق اور لاشریک مالک و حاکم ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور تمام جہان کا پروردگار، مربی اور حاجت روا ہے۔

اسی حیثیت سے اس کی وفاداری وہ قدرتی بنیاد ہے جس پر ہماری اجتماعی زندگی کی عمارت صحیح طور پر قائم ہوتی ہے۔ اور اس کی مرکزی شخصیت سے وابستگی تمام متفرق افراد اور گروہوں کے درمیان ایک امت کا رشتہ پیدا کرتی ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہماری اور تمام مخلوقات کی بندگی، اطاعت اور پرستش کا مستحق ہے۔

اسی حیثیت سے وہ ہمارا اور ہر چیز کا مالک، آقا اور فرماں روا ہے۔

اہل عرب اور دنیا کے تمام جاہل لوگ ہر زمانہ میں اس غلطی میں مبتلا تھے اور اب تک ہیں کہ ربوبیت کے اس جامع تصور کو انہوں نے پانچ مختلف النواع ربوبیتوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے قیاس و گمان سے یہ رائے قائم کی کہ مختلف قسم کی ربوبیتیں مختلف ہستیوں سے متعلق ہو سکتی ہیں اور متعلق ہیں قرآن اپنے طاقتور استدلال سے ثابت کرتا ہے کہ کائنات کے اس مکمل مرکزی نظام میں اس بات کی مطلق گنجائش نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ جس کے ہاتھ میں ہے اس کے سوا ربوبیت کا کوئی کام کسی دوسری ہستی سے کسی درجہ میں بھی متعلق ہو۔ اس نظام کی مرکزیت خود گواہ ہے کہ ہر طرح کی ربوبیت اسی خدا کے لیے مختص ہے جو اس نظام کو وجود میں لایا۔ لہٰذا جو شخص اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ربوبیت کا کوئی جزء کسی معنی میں بھی خدا کے سوا کسی اور سے متعلق سمجھتا ہے یا متعلق کرتا ہے، وہ دراصل حقیقت سے لڑتا ہے، صداقت سے منہ موڑتا ہے، حق کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور امر واقعی کے خلاف کام کر کے اپنے آپ کو خود نقصان اور ہلاکت میں مبتلا کرتا ہے۔

اَللّٰہُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(خدا، معبود)، یہ اس موجود حق کا نام ہے، جو صفات الٰہیہ کا جامع، اوصاف ربوبیت سے موصوف اور وجود حقیقی سے ممتاز ہے اس کے سوا کوئی موجود وجود بذاتہٖ کا مستحق نہیں ہے اور ہر موجود نے اسی سے وجود حاصل کیا ہے لہٰذا ہر موجود سوائے خدا کے بذاتہٖ ہالک ہے (اور خدا کے موجود کرنے سے موجود ہے)، اور ہر موجود سوائے ذات خدا کے فانی ہے اور حقیقتاً وہی ایک خدا موجود ہے اس کے سوا سب فنا ہیں یہ یعنی (اللہ) خدا کا نام ہے، اور ایسی ذات پر دلالت کرتا ہے جو بلا استثناء تمام صفات الٰہیہ کی جامع ہے اور خدا کے دوسرے نام ایک ایک معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں مثلاً علم قدرت اور فعل وغیرہ میں سے کسی ایک پر اور اس لیے وہ تمام

اسماء کی بہ نسبت اس کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ وہ اس کے سوا اور کسی کے لیے حقیقتاً یا مجازاً استعمال نہیں کیا جاتا۔ باقی اسماء کے ساتھ اور کوئی بھی موسوم کر دیا جاتا ہے جیسے قادر علیم رحیم وغیرہ انہی دو وجوہ سے ظن ہوتا ہے کہ یہ نام اسم اعظم ہے۔ تمام اسماء کے معانی کی نسبت خیال کیا جا سکتا ہے، کہ بندہ ان کے ثبوت سے متصف ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس پر رحیم علیم صبور اور شکور کا اسم بولا جا سکے اگرچہ اس قسم کے اسماء کا اطلاق بندہ پر کسی اور وجہ سے ہو اور خدا پر ان کا اطلاق اور وجہ سے مگر اللہ کا معنیٰ اس قسم کا نہیں ہے وہ خاص اللہ ہی سے مخصوص ہے اس میں کوئی حقیقی یا مجازی شرکت نہیں پائی جاتی۔ اور اسی خصوص کی وجہ سے تمام اسماء کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے نام ہیں چنانچہ یوں کہیں گے کہ الصبور اور الشکور اور الجبار اور الملک، اللہ کے نام ہیں اور یوں نہیں کہتے کہ اللہ صبور یا شکور کا نام ہے کیونکہ اسم اللہ من حیث ہو معانی الٰہیہ پر سب سے زیادہ دلالت کرتا ہے اور سب کی بہ نسبت اللہ کے ساتھ زیادہ خاص ہے لہٰذا سب سے زیادہ مشہور اور ظاہر بھی یہی وجہ ہے کہ اس کی تعریف کے لیے دوسرے اسماء کی ضرورت نہیں اور دوسرے اسماء کی تعریف کے لیے اس کی نسبت لازم ہے مثلاً رحمن کی تعریف کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ رحمن اللہ کا نام ہے۔

بندے کو اس اسم سے حصہ حاصل کرنا چاہیے یعنی بندے کا دل اور خیال اللہ تعالیٰ میں محو ہو اس کے سوا وہ نہ کسی طرف آنکھ اٹھائے نہ توجہ کرے نہ کسی سے امیدوار ہو اور نہ کسی غیر سے ڈرے اور کیوں نہ ہو جب کہ اس اسم کا مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ موجود حقیقی و برحق ہے اور باقی سب کے سوا فانی اور ہالک اور باطل ہیں پس بندہ اپنے آپ کو سب سے پہلے ہالک اور باطل سمجھے گا، جیسے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے سمجھا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: عرب کی شاعری میں سب سے زیادہ سچا شعر لبید کا ہے......

الا کل شئی ما خلا اللہ باطل

''یعنی یاد رکھو کہ اللہ کے سوا تمام موجودات فانی ہے۔''

اَلرَّحْمٰنُ ،اَلرَّحِیْمُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(الرحمن نہایت رحم والا)، (الرحیم بہت مہربان)۔ یہ دونوں اسم رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت مرحوم کی متدعی ہے اور جو مرحوم ہو گا وہ محتاج ہو گا۔ اور اگر کسی سے کسی محتاج کی حاجت بلا ارادہ و مقصد پوری ہو جائے تو اس کو رحیم نہ کہیں گے اور جو کوئی اس کی حاجت پوری کرنے کا ارادہ تو کرے مگر پوری نہ کرے تو وہ اگر اس کے پورا کرنے پر قادر تھا تو رحیم نہیں کہلائے گا کیونکہ اگر اس کا ارادہ کامل ہوتا تو اسے پورے کر دکھاتا اور اگر اس کو پورا کرنے سے عاجز ہو تو اس کو اس کی رقت قلب کے لحاظ سے رحیم کہیں گے، لیکن وہ ناقص رحیم ہے۔ رحمت تامہ یہ ہے کہ محتاجوں سے بھلائی کی جائے اور ان کے حال پر توجہ مبذول رکھتے ہوئے ان کے حق میں نیکی کا ارادہ کیا جائے۔ رحمت عامہ یہ ہے کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو شامل ہو۔ اللہ کی رحمت تامہ بھی ہے اور عامہ بھی۔

(اور ہم ان اسماء کی شرح کتاب میں چل کر خوب بیان کریں گے یہاں صرف حسب وعدہ نمونہ دکھانا منظور ہے۔)

اسم رحمان سے بندے کا خاص حصہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے غافل بندوں پر رحم کر کے ان کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے نرمی کے ساتھ غفلت کے راستہ سے پھیر کر خدا کی راہ دکھائے اور نافرمان لوگوں کو رحمت کی نظر سے دیکھے، استحقار کی نظر سے نہ دیکھے۔ اور جو برائی دنیا میں واقع ہو اس کو ایسا سمجھے کہ خود اسی کے نفس سے وقوعہ پذیر ہو رہی ہے لہٰذا مقدور بھر اس کے ازالہ میں کوتاہی نہ کرے محض اس عاصی کے حال پر ترس کھا کر کہ بے چارہ کہیں خدا کے غضب میں گرفتار نہ ہو جائے اور اس کے قرب سے محروم نہ رہ جائے۔

اسم رحیم سے بندے کا حصہ یہ ہے کہ حسب طاقت بھوکے کا پیٹ بھرے اور اپنے پڑوسی یا شہر میں فقیر کی حاجت پوری کرے اور اس کی محتاجی دور کرے خواہ اپنے مال سے یا اپنے رسوخ اور وجاہت کے ذریعہ سے یا اس کے لیے دوسرے سے سفارش کر کے اور اگر ان ساری باتوں سے عاری ہو تو ایسی شفقت اور عنایت کے ساتھ اور اظہار ہمدردی سے اس کا ہاتھ بٹائے کہ گویا اس کی تکلیف و وجیعت میں شریک ہے۔

اَلْمَلِكُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

ملک وہ ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر موجود سے مستغنی اور ہر موجود اس کا محتاج ہے بلکہ کوئی چیز اپنی ذات اور صفات میں وجود اور بقا میں غرض کسی بات میں اس سے مستغنی نہیں ہے۔ ہر موجود کا وجود اس سے ہے یا اس کے ساتھ منسوب ہونے والی کسی دوسری شے سے ہے اس کے سوا ہر چیز اپنی ذات وصفات میں اس کی مملوک ہے اور وہ ہر چیز سے مستغنی نہیں ہے الغرض ایسی ذات ملک مطلق ہے۔

بندہ ملک مطلق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ہر چیز سے مستغنی نہیں ہے اگر باقی موجودات سے مستغنی ہے تو خدا کا ہمیشہ کے لیے محتاج ہے۔ ہر چیز اس کی محتاج بھی نہیں ہے بلکہ اکثر موجودات اس سے مستغنی ہیں۔لیکن جس صورت میں کہ وہ بعض سے نہیں تو بعض دیگر سے مستغنی ہو، اس وقت وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ملک کہلا سکتا ہے۔ الغرض بندوں میں سے ملک وہ ہے جس پر خدا کے سوا کسی کا تسلط نہ ہو بلکہ وہ خدا کے سوا سب سے مستغنی ہو اور وہ بایں ہمہ اپنی سلطنت پر ایسا قابض ہو کہ فوج اور رعایا اس کی اطاعت کا دم بھرتی ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ بندے کی خاص سلطنت اس کا دل اور قالب ہے اور فوج اس کی شہوت، غضب اور خواہشات ہیں اور رعیت اس کی زبان، آنکھیں، ہاتھ اور تمام اعضاء ہیں۔ جب وہ ان پر قابض ہو جاتا اور وہ اس کے مطیع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے عالم وجود میں بادشاہ بن جاتا ہے اور اگر اس کے ساتھ ہی وہ لوگوں سے مستغنی ہو جائے اور لوگ اپنی فانی اور باقی زندگی میں اس کے محتاج ہوں تو وہ روئے زمین کا بادشاہ ہے اور یہ رتبہ انبیاء اور رسل صلوۃ اللہ وسلم علیہم کا ہے۔ وہ ابدی زندگی کی ہدایت پاتے ہیں، خدا کے سوا کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور دوسرے تمام لوگ ان کے محتاج ہیں (اور یہ مدارج محمد ﷺ پر ختم ہو گئے ہیں اسی لیے آپ خاتم النبیین ہیں) اور اس شاہی سلسلہ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد علماء کا درجہ ہے جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث ہیں۔ ان کی بادشاہی اس قدر ہوتی ہے جس قدر وہ بندوں کو ہدایت کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور جس قدر طلب ہدایت میں لوگوں سے مستغنی ہوتے ہیں ان کی صفات کی بدولت بندہ فرشتوں سے جاملتا ہے اور خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ یہ بادشاہی اس ملک برحق کی طرف سے جس کی بادشاہی میں مثیل ونظیر نہیں ہوسکتی۔ بندے کے لیے بڑا اعطیہ ہے۔

اَلْقُدُّوْسُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

تمام عیبوں سے پاک قدوس کے معنیٰ وہ ذات جو ان تمام اوصاف سے پاک ہے جن کو حس یا قوت خیال یا وہم یا عقل یا فکر ادراک کر سکیں۔ قدوس کی تعریف میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ذات جو عیوب ونقائص سے پاک ہے کیونکہ اس قسم کی تعریف ایک طرح ترک ادب ہے اس لیے اگر کہا جائے کہ حضور گورنر دام اقبالہ قوم کے جولاہے نہیں ہیں نہ نائی ہیں جو خلاف ادب سمجھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی صفت کی نفی سے اس کے امکان کا وہم ہوتا ہے اور اس ابہام ہی میں نقص ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ قدوس کے معنیٰ ہیں وہ ذات جو اوصاف کمال میں سے اس وصف سے بھی پاک ہے جو اکثر لوگوں کے ظن میں ہے کیونکہ وہ لوگ پہلے اپنے آپ میں غور کرتے ہیں اپنی صفات کو پہچانتے ہیں اور ان کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں: ایک وہ جو ان کے حق میں کمال ہیں مثلاً ان کا اپنا علم، قدرت، سمع، بصر، کلام، ارادہ، اختیار وغیرہ اور ان معانی کے یہ ہی نام رکھ لیتے ہیں اور ان ناموں کو اسماء کمال کہتے ہیں دوم وہ جو ان کے لیے نقص ہیں مثلاً ان کا جہل، عجز، کور چشمی، بہرہ پن، گونگا پن وغیرہ۔ پس ان معانی کے یہی نام رکھ لیتے ہیں وہ خدا کی زیادہ سے زیادہ تعریف یونہی کر سکتے ہیں کہ اس کو اپنے مذکورہ اوصاف سے موصوف کریں اور اپنے مذکورہ نقص سے نفی کر دیں۔ حالانکہ وہ نہ صرف ان کے اوصاف نقص سے مبرا ہے بلکہ ان کے اوصاف کمال سے بھی مبرا ہے بلکہ جو بڑی سے بڑی صفت مخلوق کے تصور میں آسکتی ہے وہ اس سے اور اس کی مشابہ اور مماثل صفات سے بھی پاک ہے۔ اگر ان صفات کے اطلاق کی اجازت نہ ہوتی تو ان میں سے اکثر کا اطلاق درست نہ ہوتا۔

بندے کا اس اسم قدوس سے یہ حصہ ہے کہ وہ اپنے ارادے اور علم کو پاک کرے علم کو تو مخیلات، محسوسات، موہومات سے اور ان تمام ادراکات سے جن میں بہائم شریک ہیں پاک کرے بلکہ اس کی جولانی نظر اور تگاپوئے علم ان ازلی اور الٰہی امور کے لیے ہو جو نہ قریب ہیں کہ حس کے ساتھ محسوس

ہوں نہ بعید ہیں کہ حس سے غائب ہوں بلکہ وہ فی نفسہٖ محسوسات اور مخیلات سے پاک ہو جاتا ہے اور علوم سے اسی طرح مستفید رہتا ہے کہ اگر اس کی حس و تخیل کا آلہ مفقود بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ ان علوم شریفہ وکلیہ والٰہیہ سے سیراب ہوتا رہتا ہے جو ازلی وابدی معلومات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان شخصی حیثیات سے جدا ہیں جو سدا متغیر و مستحیل ہوتی رہتی ہیں اور بندہ اپنے ارادے کو ان انسانی لذات کے ساتھ تعلق رکھنے سے پاک کرے جو شہوت اور غضب کی مقتضیات، اور خوراک، جماع، لباس و نظارہ کی لذائذ کہلاتی ہیں اور ان لذتوں سے بھی پاک کرے جو صرف حس اور قلب کے واسطہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ غرض خدا کے سوائے کوئی اس کے ارادے کا مطمح نظر نہ ہو خدا کی ذات کے سوائے کسی چیز میں اس کو لذت نہ ملتی ہو، خدا کے دیدار کے سوا کسی چیز کا اس کو شوق نہ ہو، خدا کے قرب کے سوا کسی چیز سے اس کو مسرت نہ ہوتی ہو اگر اس کی بجائے اس کو جنت اور جنت کی تمام نعمتیں بھی دلائی جائیں تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور گھر والے کو چھوڑ کر خالی گھر پر کبھی راضی نہ ہو۔ الغرض حسی و خیالی ادراکات میں تو بہائم بھی اس کے شریک ہیں لہٰذا اس کو چاہیے کہ اس رتبہ کو چھوڑ کر اس درجہ ترقی کرے جو انسان سے مخصوص ہے۔ بشری شہوانی لذات میں بھی بہائم مقابلہ کرتے ہیں لہٰذا ان کو ترک کر دینا چاہیے۔

حاصل کلام یہ کہ صاحب ارادہ کی عظمت اس کی مراد کی عظمت کے مطابق ہے جس شخص کا منتہائے ہمت وہی ہے جو پیٹ میں ڈال لیا تو اس کی قیمت بھی وہی ہو گی جو اس پیٹ سے نکلتا ہے اور جس شخص کا منتہائے ہمت سوائے خدا کے اور کوئی نہ ہو تو اس کا درجہ بھی حسب ہمت ہے۔ جس شخص کا علم محسوسات، تخیلات کے درجہ سے ترقی کر گیا اور ارادہ مقتضائے شہوات سے پاک ہو گیا وہ بارگاہ قدس میں باریاب ہوا۔

اَلسَّلَامُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(تمام نقصانات سے محفوظ)۔ السلام وہ ہے جس کی ذات عیب اور صفات نقص سے اور افعال شر سے محفوظ ہے اور جب ایسا ہے تو جونسی بھی سلامتی موجود ہے وہ اس کے ساتھ منسوب یا اس سے صادر شدہ ہے اور تم یہ بات بخوبی سمجھ آئے ہو کہ خدا تعالیٰ کے افعال شر سے محفوظ ہیں یعنی اس شر مطلق سے جو بذاتہٖ مراد ہو اور اس کے ضمن میں کوئی خیر اس سے بڑھ کر نہ ہو۔

اور کوئی شر اس قسم کی موجود نہیں ہے جس سے بندے کا دل بدظنی، کینہ، حسد اور ارادہ شر سے محفوظ رہے اور اس کے اعضاء معصیت اور منہیات سے محفوظ اور سلامت رہیں اور اس کے صفات کجی اور برگشتگی سے بچے رہیں وہ صحیح و سالم دل کے ساتھ خدا کو ملے گا اور یہ وہ بندہ ہے کو السلام کے خطاب کا مستحق اور اپنی صفات کے لحاظ سے اس السلام حقیقی کے اوصاف سے قریب ہے جس کی صفات کی مثل و نظیر نہیں ہو سکتی۔ صفات کی کجی سے ہماری یہ مراد تھی کہ عقل غضب و شہوت کے پنجے میں گرفتار ہو کیونکہ حق تو یہ تھا کہ اس کے برعکس ہوتا یعنی شہوت اور غضب دونوں عقل کے قابو میں ہوتے جب حالت اس کے برعکس ہوئی تو کجی اور برگشتگی لازم تھی۔ جب بادشاہ رعیت بن جائے اور مالک غلام ہو جائے تو سلامتی کیسی، سلام سے وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جس کی زبان اور اعضاء سے لوگ سلامت ہوں اور جو شخص اپنے آپ سے سلامت نہیں ہے وہ اس خطاب کا کیونکر مستحق ہو سکتا ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(اپنے وعدے میں سچا یا اپنے عذاب سے امن دینے والا)۔ مومن سے مراد وہ ذات ہے جو اسباب امن مہیا کرنے اور خوف و خطر کی راہیں بند کرنے والا ہو (اور اسی لیے امن و امان اس کی طرف منسوب کیا جائے)۔ امن خوف ہی کے قیام میں متصور ہو سکتا ہے اور خوف ہمیشہ ہلاک یا نقصان کے احتمال سے ہوتا ہے اور مؤمن مطلق وہ ذات ہے کہ جس قدر امن و امان تصور میں آ سکتا ہے وہ اسی سے مستفاد ہو۔ وہ ذات اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اندھا چونکہ کچھ نہیں دیکھ سکتا اس لیے وہ ہلاکت کے پیش آجانے سے ڈرتا ہے۔ ثابت ہوا اس کی آنکھیں ہلاکت سے امن دلاتی ہیں۔ کٹے ہوئے ہاتھ والا بھی کسی ایسی آفت سے غیر مطمئن ہے جس کا دفاع ہاتھوں سے ہوسکتا ہے پس سالم ہاتھ بھی ہلاکت سے امن دلانے والا ہوا۔ علی ہذا القیاس تمام حواس اور اعضائے بدن اور مؤمن ان سب اعضاء کا خالق اور نقش بنانے والا مکمل کرنے والا اور طاقت بخشنے والا ہے۔ فرض کرو ایک کمزور آدمی دشمنوں سے بچنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔ سخت مشکل میں گھر گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں رہی ہے اگر سکت ہے تو پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ اگر ہتھیار ہے تو اکیلا دشمن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اگر اس کے پاس فوج ہے تو اس کے شکست پانے کا اندیشہ ہے۔ کوئی قلعہ بھی نہیں کہ اس میں پناہ گزین ہو بیٹھے۔ ایسی حالت میں اس کو ایسا مددگار مل جاتا ہے جو اس کی کمزور طاقتوں میں جان ڈال دیتا ہے اپنی غیبی فوج اور اسلحہ سے اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے اردگرد ایک سنگین قلعہ بنا کھڑا کرتا ہے۔ یہ مددگار جس نے اس کو پورا امن و امان بخشا ہے فی الواقعہ المؤمن کہلانے کا مستحق ہے۔

بندہ اپنی اصل فطرت میں کمزور ہے اور اس کے باطن کو دیکھو تو امراض اور بھوک پیاس وغیرہ آفات اس میں بھری پڑی ہیں۔ ظاہر دیکھو تو وہ آگ میں جل جانے، پانی میں ڈوب جانے اور زخم اور چوٹ کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اس کو ان آفتوں سے بچانے والی وہی ذات پاک ہے جس نے مرض کو دور کرنے کے لیے دوائیں اور بھوک، پیاس کو رفع کرنے کے لیے کھانے پینے کی چیزیں بنائی ہیں اور اعضاء دیئے ہیں تاکہ بدنی نقصان پہنچانے والی چیزوں کو دفع کریں۔ حواس عطا کئے تاکہ کسی آنے والی آفت اور خطرے کی اطلاع دیتے رہیں۔ سب سے بڑا خوف آخرت کی ہلاکت کا ہے اور اس سے صرف کلمۂ توحید نجات دلاتا ہے۔ اس کی طرف بھی اللہ ہی ہدایت بخشتا ہے۔ یہ کلمۂ توحید ایک قلعہ ہے جو اس قلعہ میں داخل ہوجائے امن وامان میں آجاتا ہے۔ غرض کہ دنیا میں ہر قسم کا امن اسباب سے وابستہ ہے جن کو خاص وہی مہیا کرتا ہے۔ وہی ان کو کام میں لانے کی توفیق دیتا ہے۔ اس ذات پاک نے ہر چیز کو اس کی فطرت عطا کر کے اس پر چلنے کی ہدایت کی پس وہی مومن مطلق و برحق ہے۔ اس وصف سے بندے کا یہ حصہ ہے کہ تمام مخلوق کو اس کی طرف سے امن ہو بلکہ ہر خوفزدہ شخص دینی اور دنیوی خطرات کے دفاع میں اس کی امداد کا امیدوار ہو جیسے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہمسایہ اس کے ظلموں سے محفوظ ہونا چاہیے۔

مومن کے نام کا وہ شخص زیادہ مستحق ہے جو لوگوں کو راہ نجات دکھا کر اور طریق خدا سمجھا کر عذاب الٰہی سے امن دلائے اور یہ انبیاء اور علماء کا منصب ہے۔ اس لیے رسول کریم فرماتے ہیں: تم دوزخ میں اس طرح گروگے اور میں تم کو تمہارے اطراف بدن سے پکڑ کر تھاموں گا۔ شاید تم کہو کہ ہر خوف درحقیقت اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے پس خدا کے سوا کوئی چیز خوف دلانے والی نہیں ہے۔ وہی ہے جو بندوں کو ڈراتا ہے۔ وہی ہے جس نے ڈرانے کے اسباب بنائے ہیں تو اس کی طرف امن کو کیونکر منسوب کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خوف بھی اس کی طرف سے ہے اور امن بھی اسی کی طرف سے ہے وہی تمام خوف د امن کا سبب پیدا کرنے والا ہے اور اس کا مخوف ہونا اس کے مؤمن ہونے کا مانع نہیں بلکہ وہی معز ہے، وہی مذل بھی ہے۔ اور اس کا خافض ہونا اس کے رافع ہونے کا مانع نہیں ہے بلکہ وہی خافض بھی ہے، رافع بھی ہے۔ اسی طرح وہ مؤمن امن دینے والا بھی ہے اور مخوف ڈرانے والا بھی ہے۔ مؤمن اس کا اسم ہے، مخوف نہیں۔

اَلْمُهَيْمِنُ جل جلالہ:

اللہ کے حق میں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اپنی مخلوق کے عملوں، رزقوں اور عمروں کا انصرام کر رہا ہے۔ اس کا انصرام اپنی اطلاع اور غلبہ اور حفظ کے ساتھ ہے جو کوئی کسی امر کے تمام حالات سے واقف اس پر قابض اور اس کا حافظ ہو وہ اس کا مہیمن کہلاتا ہے۔ حالات کی واقفیت کا مطلب علم ہے۔ قبضہ کمال قدرت کا نتیجہ ہے اور حفظ عقل کی طرف راجع ہوتا ہے۔ جس میں یہ تینوں معنیٰ جمع ہوں وہ مہیمن ہے۔ یہ تینوں مطلقاً اور کامل طور پر صرف خداوند تعالیٰ میں جمع ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کو کتب قدیم میں خدا کا نام لکھا ہے۔

جو شخص لگاتار اپنی اخلاقی حالت کے متعلق غور کرتا رہے یہاں تک کہ اس کے تمام نشیب و فراز اور اسرار سے واقف ہوجائے اور ساتھ ہی اپنے دل کے احوال اور اوصاف کو درست رکھنے پر قادر ہوجائے اور ہمیشہ اس کی حالت قائم رکھنے میں مصروف رہے وہ اپنے دل کا مہیمن ہے اور اس کی واقفیت اور قدرت اور حفظ کا

دائرہ وسیع ہوگیا یہاں تک کہ وہ دوسرے بندوں کے باطنی اسرار سے فراست اور استدلال کے ذریعے سے واقف ہوکر ان کو راہ راست پر قائم رکھنے کے لیے کمر بستہ ہوجائے تو اس معنی سے اس کا حصہ اس سے اور بھی زیادہ اور مکمل ہوگا۔

اَلْعَزِیْزُ جل جلالہ:

(غالب قوی، قاہر)۔عزیز کے معنٰی: وہ عالی قدر شے جس کی مثال شاذ و نادر مل سکتی ہو جس کی از حد حاجت ہو اور اس کا حاصل ہونا بھی مشکل ہو۔کسی شے میں جب تک یہ تینوں باتیں جمع نہ ہوں اس پر اسم عزیز کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ بہت سی اشیاء ایسی ہیں کہ ان کی نظیر تو کم ملتی ہے لیکن چونکہ نہ ان کی شان بڑی ہے اور نہ ان سے چنداں زیادہ نفع ملتا ہے اور اس لیے وہ عزیز نہیں کہلاتیں۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ ان کی شان بھی بڑی ہے، فائدہ بھی ان سے بہت ہے اور ان کی نظیر بھی کوئی نہیں لیکن چونکہ ان کا حصول چنداں دشوار نہیں اس لیے ان کو عزیز نہیں کہا جاتا، مثلاً سورج اور زمین جن کی کوئی نظیر نہیں ہے اور دونوں سے اپنی اپنی جگہ نفع بھی بہت ملتا ہے اور ان کی حاجت بھی اشد ہے لیکن ان کو عزیز نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کو دیکھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ غرض عزیز ہونے کے لیے ان تینوں اوصاف کا جمع ہونا لازم ہے۔ان تینوں معنوں میں کمال اور نقصان کے مراتب بھی پائے جاتے ہیں۔عزیز کی قلت وجود کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف ایک ہو کیونکہ ایک سے کم کوئی عدد نہیں ہوسکتا اور اس کی مثل کا وجود محال ہو۔ایسی ذات خدا ہی کی ہے۔ کیونکہ مثلاً سورج اگرچہ وجود میں ایک ہی ہے لیکن امکان میں ایک نہیں ہے۔اس کی مثل کا وجود بھی ممکن ہے۔عزیز کی شدت حاجت کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز ہر بات میں اس کی محتاج ہو۔ یہاں تک کہ اپنے وجود و بقا اور صفات میں بھی۔ یہ کمال صرف خدا تعالیٰ میں ہے اور اس میں کوئی شے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔دشوار حصول ہونے کا کمال یہ ہے کہ تمام مخلوقات اپنی استدلالی نظر اور قیاس رائے کے ساتھ اس کی ذات وصفات کا پورا پورا پتہ لگانے سے بالکل عاجز ہو۔ یہ بات بھی خدا ہی سے خاص ہے اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

الغرض وہ ایسا عزیز مطلق و برحق ہے کہ اس صفت میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بندوں میں سے عزیز وہ ہے کہ بندگان خدا اپنی حیات اخروی اور سعادت ابدی کے لیے اس کے محتاج ہوں۔ایسا رتبہ بلاشبہ بہت کم لوگوں کو میسر ہوتا ہے۔ یہ رتبہ انبیاء الصلوۃ اللہ علیہم کا ہے۔پھر ان کے بعد عزت میں مشارک وہ لوگ ہیں جو ان کے قرب زمانہ سے ممتاز ہیں۔جیسے خلفائے راشدین اور انبیاء کے وارث علمائے کرام ہیں۔

اَلْجَبَّارُ جل جلالہ:

(بڑا دباؤ والا)۔جبار وہ ہے جو ہر شخص پر بطور جبر اپنا حکم جاری کرے اور اس پر کسی کا حکم جاری نہ ہوسکتا ہو اور جس کے قبضۂ قدرت سے کوئی نہ نکل سکے۔اور اس کی بارگاہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ساری ہمتیں پست ہوں۔تو جبار مطلق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک کو مجبور کرسکتا ہے اور اس کو کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔اور ان دونوں باتوں میں اس کی کوئی مثل موجود نہیں ہے۔

بندوں میں سے جبار وہ ہے کہ اتباع کے درجہ سے ترقی کرکے دوسروں کو اپنا تابع بنادے اور سب سے بڑا رتبہ حاصل کرے یہاں تک کہ لوگوں کو اپنی ہیبت و صورت سے اپنی عادت وسیرت کے مطابق چلنے پر مجبور کرے۔غرض وہ لوگوں کو فائدہ پہنچادے اور خود چنداں فائدہ نہ اٹھائے، لوگوں کا فائدہ مقدم سمجھے۔ اپنے فائدہ کی حرص نہ کرے۔لوگوں کو اپنا مطیع بنائے۔خود کسی کی اطاعت نہ کرے۔جو شخص اس کی زیارت کرے وہ اس کے دیدار میں ایسا محو ہو کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔اس کا ایسا شوق ہو کہ خود اپنی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اور کوئی شخص اس کو دھوکا دینے اور اپنا تابع بنانے کی جرأت نہ کرسکے۔اس وصف سے خاص سیدالبشر محمد رسول اللہ ﷺ بہرہ ور ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے تابع ہونے کے بغیر چارہ نہ ہوتا اور میں آدم علیہ الصلوۃ والسلام کی اولاد کا سردار ہوں اور میرے لیے یہ بات باعث فخر نہیں ہے۔

اَلْمُتَکَبِّرُ جل جلالہ:

(عظمت و بزرگی والا)۔متکبر وہ ہے جو اپنے مقابلہ میں سب کو حقیر سمجھتا ہو اور بزرگی وعظمت کا حق دار صرف اپنے آپ کو جانتا ہو۔اس لیے دوسروں کو غلاموں کی حیثیت سے دیکھتا ہو۔اگر یہ بات صحیح ہو تو وہ تکبر حق اور اس کا فاعل متکبر برحق ہوگا۔اور یہ بات علی الاطلاق خاص خدا کے لیے متصور ہے اگر وہ تکبر اور استعظام باطل ہو اور اس متکبر کو فی الحقیقت امتیازی عظمت جو اس کے زعم میں ہے حاصل نہ ہو تو اس کا تکبر بے جا اور مذموم ہوگا۔خدا کے سوا جو شخص خاص اپنے آپ کو عظمت اور بزرگی کا مستحق قرار دے اس کا قیاس غلط اور اس کی نظر باطل ہے۔

بندوں میں سے متکبر وہ زاہد ہے جو عارف بھی ہو۔عارف کے زاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق سے جو چیز اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہو وہ اس سے کنارہ کش ہو جائے اور اللہ کے سوا باقی ہر چیز سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے۔اس لیے وہ دنیا و آخرت کو حقیر سمجھے گا اور ان کو خدا کی یاد میں خلل انداز ہونے کے باعث اپنی نظروں سے گرا دے گا۔غیر عارف کا زہد ایک قسم کا معاملہ اور معاوضہ ہے کیونکہ وہ متاع دنیا کے عوض میں متاع آخرت کی خریداری کرتا ہے۔ایک چندروزہ چیز سے اس لیے دست بردار ہوتا ہے کہ اس کے عوض میں دائمی نعمت کئی گنا حاصل کرے۔یہ بیع سلم نہیں تو اور کیا ہے۔جس شخص کو نعمتیں کھانے اور عیش منانے کی خواہش اپنا غلام بنائے ہوئے ہو وہ حقیر ہے۔متکبر وہی شخص ہے جو ہر نفسانی خواہش کو اس خیال سے حقیر سمجھتا ہو کہ ان میں چوپائے بھی شریک ہیں۔

اَلْخَالِقُ، اَلْبَارِئُ، اَلْمُصَوِّرُ جل جلالہ:

(الخالق ہر چیز کا پیدا کرنے والا)۔اور (الباری ہر چیز کا موجد)۔اور (المصور مخلوقات کی طرح طرح کی صورتیں بنانے والا)۔لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ اسماء

مترادف ہیں اور ہر اسم کے معنیٰ پیدا کرنا اور اختراع کرنا ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ جو چیز عدم سے وجود میں آتی ہے وہ پہلے تقدیر کی محتاج ہے پھر تقدیر کے موافق ایجاد کی، اس کے بعد تصویر کی اور اللہ تعالیٰ اس حیثیت سے کہ وہ ایک شے کی تقدیر کرتا ہے اس کا خالق ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ اس کا اختراع کرتا ہے اس کا باری ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ وہ مخترعات کی صورتوں کو باہم عمدہ ترتیب دیتا ہے، مصور ہے۔ مثلاً ایک عمارت کا بنانا منظور ہو تو پہلا کام انجینئر کا ہوگا جو اس عمارت کی نوعیت وصورت تجویز کر کے ایک نقشہ تیار کرتا ہے اور اس پر اینٹ پتھر، چونا، لکڑی وغیرہ صرف ہونے والے مسالہ کی مقدار کا اندازہ لگا کر اس کے اخراجات کا تخمینہ کرتا ہے۔ اس کے بعد معمار کا کام شروع ہوتا ہے جو اس نقشہ کے موافق عمارت کی بنیاد ڈالتا ہے اور مسالہ کی تجویز کردہ مقدار کے اندر اندر پوری عمارت بنا کھڑی کرتا ہے۔ ابھی تک وہ عمارت غیر مکمل اور نا قابل سکونت ہوتی ہے تو ایک تیسرے صناع یعنی مصور کے ہاتھ سے وہ ایک شان دار قصر اور شاہی ایوان بن جاتی ہے۔ یہ تو انسانی کاموں کی مثال تھی خدا کا کام اس سے برتر ہے وہ خود ہی اندازہ قائم کرتا ہے اور خود ہی بناتا ہے اور خود ہی اس کی ظاہری صورت کو آراستہ کرتا ہے یا یوں کہو کہ وہی خالق وہی باری وہی مصور ہے۔ مثال کے طور پر انسان کو لو جو اس کی مخلوقات میں سے اس کی ایک مخلوق ہے اس وجود کے لیے سب سے پہلے ایک مجسمہ ضروری تھا جس کو انسانی صفات سے متصف کیا جا سکے۔ یہ مجسمہ مٹی اور پانی دونوں کی ترکیب سے تیار ہونا ضروری تھا کیونکہ صرف مٹی ایک خشک اور ٹھوس چیز ہے جس میں نرمی اور لچک نہیں ہے اور صرف پانی ایک تر اور سیال شے ہے جو قائم اور متماسک نہیں ہے لہٰذا ان دونوں خشک اور تر چیزوں کا مرکب اور معتدل مادہ اس مجسمہ کے مناسب تھا اس کے بعد آگ کا جز بھی ان میں شامل ہونا بہتر تھا جس سے مٹی اور پانی کا قوام مستحکم ہو جائے اس کے بعد ضروری تھا کہ پانی اور مٹی کی خاص مقدار معین ہو جس سے مٹی کی خاص مقدار معین ہو کیونکہ اگر تھوڑی سی مقدار ہو تو اس مجسمہ سے انسانی افعال سرزد نہیں ہو سکتے اور ضعف اور ہلاکت سے اس کا وہی حال ہو جو کیڑے مکوڑے کا ہوتا ہے۔ اتنی بڑی مقدار بھی فضول تھی کہ یہ مجسمہ پہاڑوں اور ٹیلوں کے برابر بن جاتا کیونکہ اتنے بڑے قد اور جسامت کی کوئی حاجت نہ تھی یہ ساری باتیں اندازہ اور تجویز ہیں جس کو دوسرے لفظوں میں تقدیر کہتے ہیں پس اللہ تعالیٰ ان امور کی تقدیر اور تقدیر کے موافق ایجاد کرنے کے لحاظ سے خالق ہے اور محض ایجاد کرنے اور عدم سے وجود میں لانے کے لحاظ سے باری ہے۔ ایجاد اور چیز ہے اور ایجاد موافق تقدیر اور چیز ہے۔ اسم مصور خدا پر اس حیثیت سے صادق آتا ہے کہ اس نے تمام اشیاء کی صورتوں کو نہایت خوبی سے مرتب کیا ہے اور اچھی صورت پر بنایا اور یہ اوصاف فعل سے ہے اس کی حقیقت وہی شخص جان سکتا ہے جو تمام عالم صورت کو پہلے بالاجمال پھر بالتفصیل جانتا ہو کیونکہ تمام عالم ایک شخص کا حکم رکھتا ہے جو باہم ایک دوسرے کو کسی غرض مطلوب پر مدد دینے والے اعضاء سے مرکب ہو۔ اس کے اعضاء واجزاء آسمان اور ستارے اور زمین اور ان کے مابین کی اشیاء مثلاً پانی ہوا وغیرہ ہیں۔ اس کے اجزا ایسی ترتیب سے مرتب ہیں کہ اگر اس ترتیب میں تغیر آ جائے تو نظام میں خلل آ جائے۔ اس لیے جو جز واوپر رہنا چاہیے وہ بالائی سمت سے مخصوص ہے اور جو نیچے ہونا مناسب ہے وہ زیرین سمت سے خاص ہے جیسے کہ معمار دیواروں کی بنیاد میں پتھر اور ان کے بالائی حصہ پر لکڑی رکھتا ہے یہ اتفاقاً نہیں بلکہ اس کے نزدیک یہ ترتیب مکان کی مضبوطی کے لیے ضروریات سے ہے اگر اس کے خلاف پتھر کو اوپر اور لکڑی کو نیچے رکھا جائے تو عمارت ضرور منہدم ہو جاتی اور ہیئت ہرگز قائم نہ ہو سکتی۔ اسی پر ہم کرۂ ارض کرۂ وماء وغیرہ کا نیچے ہونا اور ستاروں کا اوپر ہونا قیاس کر سکتے ہیں۔ اگر تھوڑے سے اجزاء عالم کا ذکر اور ان کی ترتیب کی حکمت بیان کرنے لگیں تو ایک دفتر بن جائے گا۔ اس تفصیل کا جتنا کسی کو علم ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ مصور کے معنیٰ سے واقف ہوگا۔ یہ ترتیب وتصویر اجزائے عالم میں سے ہر وجود میں موجود ہے اگرچہ وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو یہاں تک کہ چیونٹی اور کیڑے میں بلکہ چیونٹی اور کیڑے کے ہر عضو میں موجود ہے ہر ایک جاندار کا ایک چھوٹا سا عضو آنکھ ہے اگر اس کی صورت کی تفصیل لکھیں تو کلام ختم نہ ہوگا۔ جو شخص آنکھ کے طبقات اور ان کی ہیئت اور شکل مقدار رنگ اور ان کی وجہ حکمت سے واقف نہیں وہ ان کی صورت سے واقف نہیں اور نہ ان کے مصور سے واقف ہے صرف نام ہی نام جانتا ہے یہی حال ہر حیوان نبات کی صورت بلکہ ان کے ہر جزو کی صورت کا ہے۔

اسم مصور سے بندہ کا حصہ یہ ہے کہ اس کے نفس میں تمام وجود کی صورت بالترتیب حاصل ہو حتی کہ وہ تمام ہیئت عالم کو محیط ہو گویا یہ تمام عالم اس کے زیر نظر ہے پھر تمام پر تفصیلی غور کرے چنانچہ انسانی صورت کے بدن اور اجزاء جسمانی کا حال معلوم کرے ان کے انواع عدد ترکیب اور انسان کی آفرینش اور ترکیب کی حکمت کو سمجھے پھر اس کی معنوی صفات اور معانی شریفہ کو معلوم کرے جن سے اس کے ادراکات اور ارادے وابستہ ہیں اور اسی طرح حیوانات اور نباتات کی صورتوں کو اپنے مقدور بھر ظاہر و باطن سے ملاحظہ کرے یہاں تک کہ تمام اشیاء کا نقش اور صورت اس کے ذہن میں منقش ہو جائے یہ حال تو صور جسمانیہ کی معرفت کا تھا۔ یہ سلسلہ روحانیت کی

ترتیب کی بہ نسبت بہت مختصر ہے جس میں ملائکہ اور ان کے مراتب اور ان کے مقررہ تصرفات کی معرفت داخل ہے۔ ملائکہ کے یہ تصرفات وہ ہیں جو وہ آسمانوں اور ستاروں میں کرتے ہیں پھر قلوب بشریہ میں ہدایت وارشاد کا تصرف کرتے ہیں اور حیوانات میں ان کو اپنی حاجات کا احساس دلانے کا تصرف کرتے ہیں۔غرض کہ اس اسم سے بندہ کا یہ حصہ ہے کہ وہ صور علمیہ کا جو صور وجودیہ کے مطابق ہیں اکتساب کرے کیونکہ علم اس صورت میں منقش فی النفس کا نام ہے جو صورت معلوم کے مطابق ہو وہ صور کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم صور کے اعیان میں موجود ہونے کا سبب ہے۔ وہ صور جو اعیان میں موجود ہوں وہ انسان کے دل میں صور علمیہ کے حاصل ہونے کا سبب ہیں اور اس طرح بندہ خدا کے اسماء میں سے اسم مصور کے معنیٰ سے علم حاصل کرتا ہے اور نیز وہ اپنے نفس میں صور حاصل کرنے کے باعث گویا کہ وہ مصور ہے اگر چہ بطور مجاز ہو۔ کیونکہ یہ صورت اس میں بالتحقیق اللہ تعالیٰ کی ایجاد واختراع سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ بندہ کے فعل سے لیکن بندہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فیضان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو متغیر نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ خود متغیر نہ کریں۔

الخالق اور البارئ میں بندہ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مگر بمجاز بعید جس کی توجیہ یہ ہے کہ خلق اور ایجاد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی قدرت کو اپنے علم کے مطابق کام میں لایا جائے اور اللہ تعالیٰ نے بندہ کے لیے علم اور قدرت پیدا کی ہے اور اس کو اپنی تقدیر اور علم کے موافق مقدورات کے حاصل کرنے کا موقعہ میسر ہے۔ اور امور موجودہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا حصول ہرگز بندوں کی قدرت میں نہیں ہے جیسے آسمان اور ستارے زمین حیوانات اور نباتات وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا حصول صرف بندوں کی قدرت سے وابستہ ہے اور یہ وہ ہیں جو اعمال عباد کہلاتے ہیں جیسے صناعات، سیاسات، عبادات اور مجاہدات چنانچہ جب بندہ ریاضتوں کے ساتھ اپنے نفس کے مجاہد میں اور اپنی مخلوق کی سیاست میں ایسے مدارج پر پہنچ جائے جن میں وہ ایسے امور کے استنباط کا امتیاز حاصل کرلے جن کو پہلے کسی نے استنباط نہ کیا ہو اور ساتھ ہی وہ ان کے کرنے اور ان کے ترغیب دینے پر قادر بھی ہو تو اس کو اس چیز کا مخترع کہا جائے گا جس کا پہلے وجود نہ ہو چنانچہ شطرنج وضع کرنے والے کے حق میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کا واضع اور مخترع ہے کیونکہ اس نے ایک ایسی چیز وضع کی ہے جو پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ ہاں اتنی بات ہے کہ اگر اس نے کوئی ایسی چیز وضع کی جس میں کوئی نیکی نہیں ہے تو وہ مدح وستائش کا مستحق نہ ہوگا اسی طرح ریاضیات، مجاہدات، سیاسات اور صناعات میں جو نیکیوں کا سرچشمہ ہیں صور اور ترتیبات ملحوظ ہیں جن کو لوگ ایک دوسرے سے سیکھ لیتے ہیں اور پہلے استنباط کرنے والے کی طرف ترقی کرتے ہیں گویا یہ واضع ان صور کا مخترع اور خالق ہے حتیٰ کہ اس پر یہ اسم مجازاً اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کے اسماء میں سے کئی اسماء ایسے ہیں جن کو بندہ کی طرف مجازاً نقل کیا جائے گا اس قسم کے اسماء بہت ہیں اور بعض ایسے اسماء ہیں جو بندہ کے حق میں حقیقتاً ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حق میں مجازاً جیسے الصبور اور الشکور۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ اسم کی مشارکت تو دیکھ لی جائے مگر مذکورہ تفاوت پر غور نہ کیا جائے۔

اَلْغَفَّارُ جل جلالہ:

(بہت بخشنے والی ذات) وہ ذات پاک ہے جو خوبی کو ظاہر کرتی ہے اور برائیوں اور گناہوں کو دنیا میں پردہ ڈال کر اور آخرت میں بخش کر رفت گزشت کر دیتی ہے۔ غفر کے معنیٰ ستر ہے۔ اللہ کا پہلا ستر اپنے بندے کے عیوب پر یہ ہے کہ اس کے بدن کے بدنما اور گھناؤنے حصے جو آنکھوں کو برے معلوم ہوتے ہیں اس کے باطن میں چھپا دیئے جو اس کے جمال ظاہری کے رنگ وروغن میں پنہاں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ بندے کے باطن اور ظاہر کی صفائی اور عدم صفائی اور خوبصورتی اور بدصورتی میں کس قدر فرق ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ خدا نے انسان کے جسم کا کون سا حصہ دکھایا ہے اور کون سا چھپایا ہے۔

دوسرا ستر یہ کہ اس کے برے خیالوں مذموم ارادوں اور مکروہ عقیدوں کو اس کے دل کی اندھیری کوٹھڑی میں بند کیا ہے تاکہ کوئی شخص ان شرمناک بھیدوں سے واقف نہ ہو۔ اگر خلقت کو اس کے دل کا حال معلوم ہو جاتا اور اس کے وسوسوں اور دل کے کھوٹ خیانت اور بدظنی کا پتہ لگ جاتا تو لوگ اس کے دشمن بن جاتے بلکہ اس کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کرتے۔ غور کرنا چاہیے کہ خدا نے اس کے اسرار اور مخفی امور کو کس طرح دوسرے لوگوں سے محفوظ رکھا ہے۔

تیسرا ستر یہ ہے کہ وہ بندے کے ایسے گناہ بخش دیتا ہے جن سے وہ سرعام رسوا ہونے کا مستوجب ہوتا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے اگر بندا ایمان پر ثابت رہا تو اس کے چھوٹے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ تاکہ ان نیکیوں کے ثواب سے اس کے بڑے بڑے گناہ دب جائیں۔

اس اسم سے بندہ کا حصہ یہ ہے کہ اپنے متعلق جو بات ہو مخفی رکھے اسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے قیامت کے دن خدا اس کے عیب ڈھانکے گا۔ غیبت کرنے والا، عیب جوئی کرنے والا، دل میں کینہ رکھنے والا، برائی کا بدلہ لینے والا یہ سب اس مبارک وصف سے محروم ہیں۔ اس وصف سے صرف وہی شخص متصف ہے جو مخلوق خدا کی خوبیوں کے سوا کوئی بات ظاہر نہ کرے۔ مخلوق میں کمال بھی ہے نقص بھی۔ خرابی بھی ہے، خوبی بھی۔ جو شخص برائیوں سے چشم پوشی کرے اور خوبیوں کا اظہار کرے وہ اس اسم سے پورا بہرہ مند ہے۔ جیسے کہ روایت ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے حواریوں سمیت ایک مردہ کتے کے پاس سے گزرے جس کی بدبو پھیل رہی تھی لوگوں نے کہا کہ مردار کس قدر سڑا ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اس کے دانتوں کی سفیدی کیسی چمکیلی ہے۔ جس سے آپ کا مدعا یہ تھا کہ ہر چیز کے اچھے حصے کا ذکر کرنا چاہیے۔

اَلْقَهَّارُ جل جلالہ:

(زبردست یا غلبہ رکھنے والا)۔ قہار وہ ہے جو اپنے بڑے بڑے طاقت ور دشمنوں کی کمر توڑ ڈالے ان کو ہلاک کرے یا ذلیل بنا کر قہر رسیدہ کرے بلکہ قہار وہ ذات ہے جس کے قہر و قدرت کے پنجہ میں ہر موجود مسخر اور اس کے قبضہ میں عاجز ہو۔

بندوں میں سے قہار وہ ہے جو اپنے دشمنوں کو مورد قہر بنائے۔ انسان کا سب سے زیادہ سرکش دشمن نفس ہے جو اس کے پہلو میں موجود ہے۔ جو شیطان سے بھی
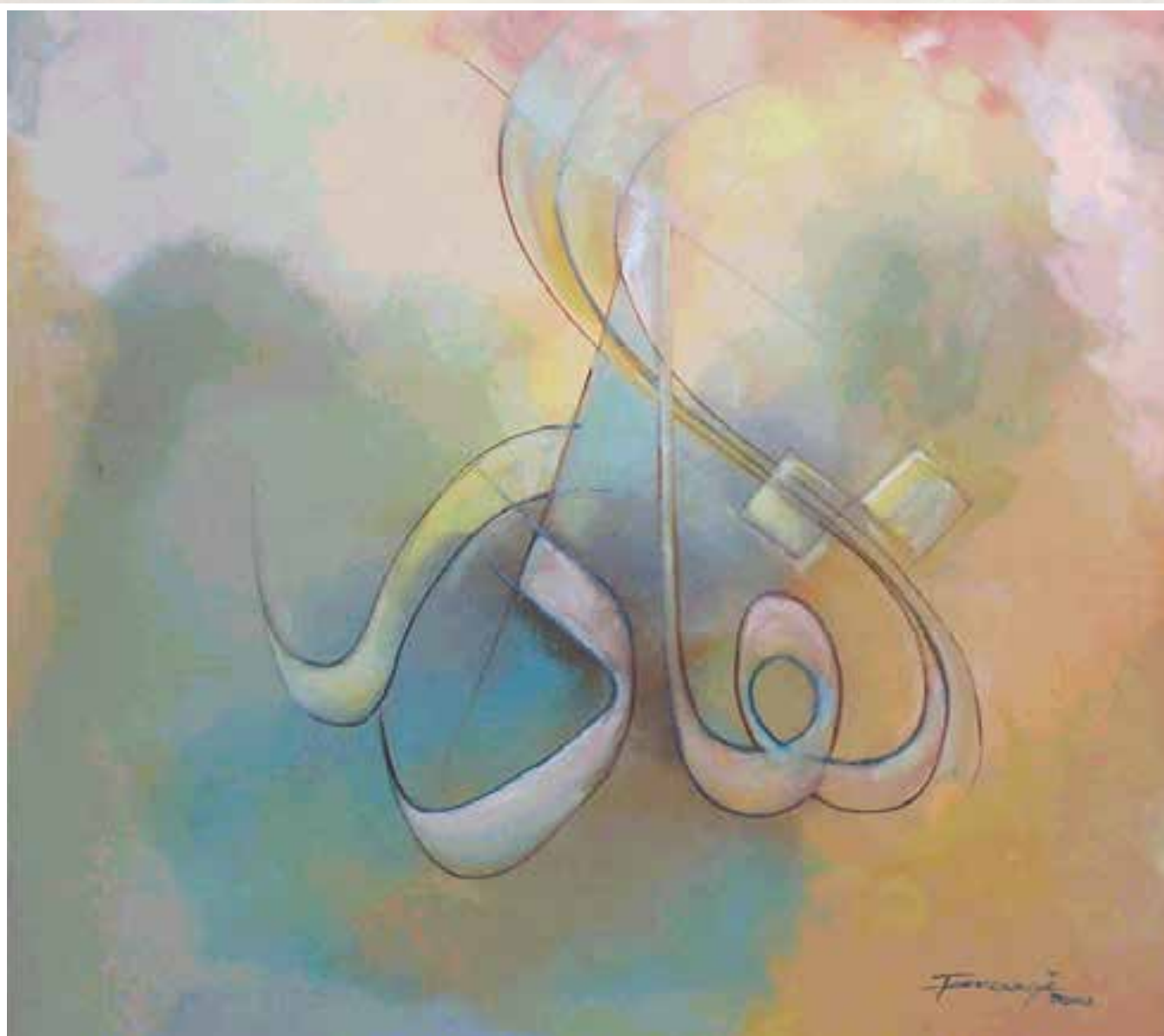
بڑھ کر اس کی دشمنی پر آمادہ ہے جو اس کو دھوکا دیا کرتا ہے۔ جب بندہ اپنے نفس کی خواہشوں کو قابو میں کر لیتا ہے تو شیطان بھی دب جاتا ہے کیونکہ شیطان ان ہی خواہشات کے ذریعہ سے انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے شیطان کا ایک جال عورتیں ہیں جس شخص میں شہوت کی قوت نہ ہو وہ اس پھندے میں نہیں پھنستا۔ اسی طرح جو شخص دین کی اطاعت اور عقل کی پیروی سے اس خواہش کو روکے وہ اس سے امن میں رہتا ہے۔ جب آدمی اپنے نفس کی شہوت پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ تمام لوگوں کو قابو میں کر لیتا ہے پس اس پر کسی کا داؤ نہیں چل سکتا کیونکہ اس کے دشمن کا بڑے سے بڑا مدعا یہ ہوگا کہ اس کے جسم کی ہلاکت کر دے اور یہ گویا اس کی روح کو زندہ کرتا ہے کیونکہ جو شخص اپنی زندگی میں خواہشات کو مار لیتا ہے وہ موت کے بعد ابدی زندگی پاتا ہے خدا فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں کام آئے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے اللہ کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔

اَلْوَهَّابُ جَلَّ جَلَالُهُ:

(بہت عطا کرنے والا)، ہبہ کے معنیٰ عوض اور غرض کے بغیر بخشش کرنے کے ہیں۔ جب اس قسم کی بخششیں بکثرت ہوں تو ان کے فاعل کو جواد اور وہاب کہتے ہیں۔ اور حقیقی جود وعطا اور ہبہ صرف اللہ تعالیٰ سے متصور ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہی ہر محتاج کی حاجت بلا معاوضہ و بلا کسی فوری یا بدیر حاصل ہونے والی غرض سے پوری کرتا ہے جو کسی غرض کے لیے کچھ عطا کرے جو فی الفور یا بدیر حاصل ہونے والی ہو اور وہ غرض یا محض مدح وستائش ہو یا باہمی رفع الزام یا حصول رتبہ وشہرت ہو تو وہ اپنی عطا کا عوض پا رہا ہے۔ وہاب یا جواد کے لقب کا حق دار نہیں کیونکہ عوض ہمیشہ عین ہی نہیں ہوتا بلکہ جو امر کہ ابھی حاصل نہیں اور عطا کرنے والے کا مدعا اس عطا سے وہی ہو وہ عوض ہے۔ پس جس شخص نے اس لیے عطا و بخشیش کی کہ اس کی عزت ہو یا اس کی تعریف کی جائے یا اس کے لیے کہ اس کی بہ نسبت بدگوئی نہ کی جائے تو وہ شخص گویا ایک قسم کا لین دین کر رہا ہے۔ حقیقی جواد وہ ہے جس سے طالب کو بلا معاوضہ فائدے حاصل ہوں بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے بخلوص نیت کرتا ہے اور وہ کام اس کی اصلی غرض اور وہی اس کا عوض ہے۔ بندہ سے جود و بخشش متصور ہی نہیں ہوسکتی کیونکہ تا وقتیکہ وہ اس کام کے کرنے کو اس کے ترک سے اولیٰ خیال نہیں کرتا، اس وقت وہ اس کو ہاتھ نہیں لگاتا پس اس کا فعل کسی ذاتی غرض پر مبنی ہوگا لیکن جو شخص اپنا تمام مال حتیٰ کہ اپنی جان بھی خاص اللہ کے لیے دے ڈالے نہ بہشتی نعمتوں کے حصول کے لیے نہ عذاب دوزخ کے خوف سے اور نہ کسی فوراً یا بدیر حاصل ہونے والے مطلب کے لیے جو بشری مطالب میں سے ہو البتہ یہ شخص ایک طرح سے وہاب اور جواد کے خطابات کا مستحق ہے۔ اس سے کم رتبہ وہ شخص ہے جو اس غرض سے بخشش کرے کہ بہشت کی نعمتیں حاصل ہوں اور اس سے نیچے اس شخص کا درجہ ہے جو اپنے ذکر خیر کی خاطر سخاوت کرے جو شخص اپنے جود وعطا کے عوض میں ایسی چیز کا طالب ہو جس کا دست بدست لین دین ہوسکتا تو وہی لوگ اس کو جواد کے لقب کا حق دار سمجھتے ہیں جن کے نزدیک صرف مادی چیزیں عوض ہوسکتی ہیں۔

سوال: جو شخص اپنا تمام مملوکہ مال بلا کسی عاجل و آجل غرض کے خالصاً لوجہ اللہ دے ڈالتا ہے اس کو کیوں جواد نہیں کہا جاتا۔ حالانکہ وہ کوئی حظ نہیں پاتا؟

جواب: یہ ہے کہ اس کا حصہ خاص خدا کی ذات اس کی رضا اور اس کا دیدار اور اس کا وصال ہے اور یہ حصہ وہ سعادت عظمیٰ ہے جس کو انسان اپنے افعال اختیاریہ کی بدولت حاصل کرتا ہے اور یہ وہ حصہ ہے جس کے آگے سارے حصے ناچیز ہیں۔

سوال: یہ جو کہا کرتے ہیں کہ خدا کا عارف جو اس کی عبادت کرتا ہے تو خدا کی ذات کے سوا اور کوئی غرض اس کو مدنظر نہیں ہوتی۔ اس کا کیا مطلب ہے اگر بندہ کا فعل غرض سے خالی ہو نہیں سکتا تو خاص خدا کی خاطر عبادت کرنے والے اور کسی دوسری غرض کے لیے عبادت کرنے والے میں کیا فرق ہے؟

جواب: جمہور کے نزدیک حظ (غرض) سے مراد لوگوں کے مشہور اغراض ہیں جو شخص ان سے دست بردار ہو جاتا ہے اور اس کا مقصد خدا کی ذات کے سوا اور کوئی شے نہیں رہتی تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اغراض کو ترک کر دیا ہے یہ ایسا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ غلام اپنے آقا کا لحاظ نہ خاص آقا کے لیے کرتا ہے بلکہ اس کے انعام کے لیے کرتا ہے جو اس کو اپنے آقا سے حاصل ہوتا ہے اور آقا اپنے غلام کے ساتھ حسن سلوک کوئی اس کی ذات کے لیے نہیں کرتا بلکہ اس کی خدمت گزاری کی

خاطر کرتا ہے جو اپنے غلام سے مطلوب ہوتی ہے مگر باپ جو اپنے بیٹے کی پرورش اور اس کے ساتھ ہر طرح حسن سلوک کرتا ہے تو خاص اس کی ذات کے لیے کرتا ہے کسی غرض کے لیے نہیں جو بیٹے سے مطلوب ہو بلکہ اگر بالکل کوئی فائدہ بیٹے سے حاصل نہ بھی ہوتا ہو تو بھی اس کے مصالح میں برابر مدد دیتا رہے گا اور جو شخص کوئی چیز طلب کرے جس سے خاص اس چیز کی ذات مطلوب نہ ہو بلکہ اس کے ذریعے سے کوئی اور شے حاصل کرنا منظور ہو تو گویا وہ اس چیز کا طالب نہیں ہے کیونکہ اس کی طلب کا وہ اصلی مدعا نہیں ہے بلکہ اصلی مدعا اور شے ہے جیسے ایک شخص سونے کی جستجو میں ہے تو سونا اس کا مطلب بذاتہٖ نہیں ہے بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ اس کے ذریعہ سے پوشاک اور خوراک کا سامان حاصل کرے۔ اور پھر یہ امور بھی مطلوب بذاتہٖ نہیں ہیں اس لیے مطلوب ہیں کہ انکے ذریعے سے آرام اور دفع تکلیف کا مقصد حاصل ہو یہ امور البتہ مطلوب بذاتہٖ ہیں ان سے آگے اور کوئی شے حاصل کرنا متصور نہیں ہے۔ غرض سونا طعام کا ذریعہ ہے اور طعام آرام کا وسیلہ ہے اور آرام ہی اصل مقصود ہے۔ یہ آگے کسی اور چیز کا واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹا والد کے حق میں واسطہ نہیں ہے بلکہ باپ کو بیٹے کی سلامتی خاص بیٹے کے لیے مطلوب ہے۔ کیونکہ بیٹے کی ذات ہی اس کی ملحوظ کا خاطر ہے اور اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت جنت کی خاطر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی عبادت کو طلب جنت کا واسطہ بنایا ہے اس کا آخری مقصد نہیں بنایا، واسطہ کی علامت یہ ہے کہ اگر مطلوب اس کے بغیر ہی حاصل ہو جائے تو اس کو واسطہ نہیں کہا جاتا جیسے کہ اگر مذکورہ مقاصد سونے کے بغیر حاصل ہو جائیں تو کوئی سونے کا نام بھی نہ لے کیونکہ اصلی غرض کا حاصل کرنا منظور ہے۔ اگر اس شخص کو جو جنت کی خاطر عبادت کرتا ہے یونہی جنت حاصل ہو سکتی تو وہ خدا کی عبادت نہ کرتا کیونکہ اس کی محبوب و مطلوب صرف جنت ہے نہ کہ کوئی اور شے لیکن جس کا اصل مطلوب و محبوب خاص خدا کی ذات ہے اور کوئی شے نہیں بلکہ خدا کے دیدار اس کے قرب اور ملاء اعلیٰ کی مواقفت سے مسرور رہنا اس کی غرض ہے اس کی نسبت جو کہا جائے گا کہ وہ خدا کی عبادت خاص خدا ہی کے لیے کرتا ہے تو اس کا یہ معنی نہیں ہوگا کہ وہ کسی مدعا کا طالب نہیں بلکہ یہ معنیٰ ہوگا کہ اس کا مدعا خاص خدا کی ذات ہے اس سے اور کوئی غرض اس کو مدنظر نہیں ہے اور جو شخص دیدار الٰہی اور معرفت اور مشاہدہ اور قرب کے سرور کی لذت پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس کا شائق نہیں ہو سکتا اور جو اس کا شائق نہیں اس کی نسبت یہ تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ ذات خداوند اس کی مقصود ہو لہٰذا اس کی عبادت کی وہی کیفیت ہوگی جیسے کوئی مزدور اجرت کی طمع پر کام کرتا ہے اکثر لوگ اس لذت سے ناآشنا اور اس کے معنیٰ سے ناواقف ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ مشاہدہ ذات باری کی کیا لذت ہے وہ زبان ہی زبان سے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے دلوں کا میلان صرف بڑی آنکھ والی پیاری پیاری حوروں کی طرف ہے اس بیان سے ثابت ہوا کہ اگر خدا کی لذت یعنی اس کے دیدار اور قرب کو غرض و مدعا کہا جا سکتا ہے تو اغراض و مقاصد سے بری ہونا محال ہے اور اگر غرض و مقصد سے وہ معنیٰ مراد ہو جو عموماً مشہور ہے اور لوگ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں تو وہ غرض نہیں ہے اور اگر اس سے مراد وہ شے ہو جس کا حصول بندہ کے حق میں عدم حصول سے بہتر ہو تو اس کو غرض میں شمار کیا جائے گا۔

اَلرَّزَّاقُ جل جلالہٗ:

رزاق سے مراد وہ ذات پاک ہے جس نے روزی کی محتاج مخلوقات کو پیدا کر کے اس کو روزی پہنچائی اور اس کے لیے روزی سے فائدہ اٹھانے کے اسباب پیدا کئے۔ رزق کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری رزق جس سے مراد غذا و خوراک ہے جو اشیاء ظاہرہ کے لیے ہے۔ دوسرا رزق زیادہ قابل عزت ہے اور وہ رزق باطن ہے اس سے مراد معرفت اور کشف ہے۔ یہ قلب اور روح کے لیے ہے کیونکہ اس رزق کا ثمرہ ابدی زندگی ہے اور رزق ظاہری کا ثمرہ یہ کہ ایک خاص مدت محدود تک جسم کی قوت قائم رہتی ہے۔ اللہ یہ دونوں رزق پیدا کرتا ہے اور دونوں فریقوں کو اس سے بہرہ ور بناتا ہے۔ اس وصف سے بندہ کا اصلی حصہ دو امر ہیں: ایک تو یہ کہ اس وصف کی حقیقت سمجھے اور یقین کرے کہ خدا کے سوا اور کوئی اس وصف کا مستحق نہیں ہے لہٰذا ہمیشہ خدا ہی کو روزی رساں سمجھے اور اس کے متعلق خدا ہی پر توکل کرے جیسے کہ حاتم اصم کی نسبت روایت ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا تم کہاں سے کھاتے ہو؟ حاتم نے کہا اس کے خزانے سے۔ سائل نے کہا کیا وہ آسمان سے تمہاری طرف روزی پھینکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر زمین اس کی اپنی نہ ہوتی تو بے شک اس کو آسمان ہی سے روزی پھینکنی پڑتی۔ سائل نے کہا تم کلام کی تاویل کر لیتے ہو۔ حاتم نے فرمایا اس لیے کہ اس نے آسمان ہی سے کلام نازل فرمایا ہے۔ سائل نے کہا معاف کیجیے! میں آپ سے بحث کی تاب نہیں رکھتا۔ حاتم نے کہا اس لیے کہ حق کے آگے باطل نہیں ٹھہر سکتا۔ بندہ کے حصہ میں دوسرا امر یہ ہے کہ خدا اس کو نیک ہدایت کرنے والا، علم اور نیکی کا راستہ دکھانے والی زبان اور صدقہ اور خیرات دینے والا ہاتھ عطا کرے اور وہ اپنے نیک اعمال اور اقوال کی بدولت

لوگوں کے دلوں میں سب سے زیادہ قابل عزت رزق پہنچنے کا موجب ہو اور خدا اپنے بندے پر جب محبت کی نظر کرتا ہے تو اس کی طرف لوگوں کی حاجت بڑھا تا ہے اور جب وہ اللہ اور اللہ کے بندوں کے مابین وصول رزق کا ذریعہ بن جاتا ہے تو اس وصف سے بخوبی بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے دیانتدار خزانچی کہ جو کچھ اس کے مالک نے فرمایا ہو دل کی خوشی سے دیتا ہے وہ خیرات وصدقہ دینے والا ہے۔ بندوں کے ہاتھ خدا کے خزانے ہیں پس خدا نے جس شخص کے ہاتھوں کو بدنوں کے رزق کا خزانہ بنایا ہو اس نے اس وصف سے بہت بڑا حصہ حاصل کیا۔

اَلْفَتَّاحُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(مشکل کشا یا بندوں میں حکم کرنے والا)۔ فتاح وہ ہے جس کی عنایت سے ہر مغلق کا دروازہ کھل جاتا ہے اور جس کی ہدایت سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے کبھی وہ اپنے انبیاء کے ہاتھ پر ممالک فتح کرتا ہے اور دشمنوں کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے اور فرماتا ہے: انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله۔ تحقیق فتح دی ہم نے تجھے فتح ظاہر تاکہ بخشے واسطے تیرے خدا اور کبھی اپنے اولیاء کے دلوں سے حجابات اٹھا کر ان کے لیے عالمِ ملکوت اور جمالِ کبریائی کی طرف دروازے کھول دیتا ہے اور فرماتا ہے اللہ لوگوں پر جو رحمت کے دروازے کھولتا ہے کوئی ان کو بند نہیں کر سکتا اور جس کے ہاتھ میں غیب کی کنجیاں اور رزق کی کنجیاں ہوں وہ فتاح کہلانے کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔

بندے کو یہ درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی زبان کے ساتھ مشکلات الٰہیہ کے نکات حل ہوں اور اس کی معرفت سے وہ دینی اور دنیوی امور آسان ہو جائیں جو لوگوں کے لیے مشکل ہو رہے ہیں، تاکہ اس کو اسم فتاح سے پورا حصہ مل سکے۔

اَلْعَلِيْمُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(بہت جاننے والا)، اس کے معنی ظاہر ہیں، اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن اور دقیق و جلیل چیز کا علم اول سے آخر تک رکھتا ہو اور یہ علم وضوح و کشف کے سب سے زیادہ مکمل طریقہ سے ہو جس سے زیادہ ظاہر کوئی بھی مشاہدہ اور کشف تصور میں نہیں ہو سکتا پھر یہ کہ وہ معلومات کے ذریعے سے حاصل نہ کیے گئے ہوں۔

بندہ کا علیم کے اسم سے جو حصہ ہے وہ مخفی نہیں لیکن اس کا علم خدا کے علم سے تین باتوں میں جدا ہے: ایک تو یہ کہ بندہ کی معلومات گو گنتی میں کتنی ہی زیادہ ہوں مگر وہ ایک محدود مقدار رکھتی ہیں پس ان معلومات سے ان کو کیا نسبت جو بے انتہا ہوں، دوم یہ کہ بندہ کا کشف گو کتنا ہی کیوں روشن نہ ہو مگر اس حد تک نہیں پہنچ سکتا جس کے بعد اور روشنی کا درجہ ممکن نہ ہو بلکہ اس کا مشاہدہ ایسا ہوگا جیسے ایک باریک پردے سے دیکھ رہا ہو اور پھر درجات مشاہدہ میں جو فرق ہے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ باطنی بصیرت کا حال ظاہری بصارت کا سا ہے اور طلوع فجر کے وقت کسی چیز کے دکھائی دینے اور سورج نکلنے کے بعد دکھائی دینے میں بڑا فرق ہے۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم اشیاء کے علم سے حاصل نہیں ہے، بلکہ اشیاء اس کے علم سے مستفاد ہیں، اور بندہ کو جو اشیاء کا علم ہے وہ اشیاء کے تابع اور اشیاء ہی سے حاصل ہے اگر اس فرق کے سمجھنے سے ابھی تمہارا ذہن قاصر ہو تو شطرنج کی بازی سیکھنے والے کو علم کو واضع شطرنج کے علم سے ملا کر دیکھو اور غور کرو کو واضع کا علم شطرنج کے وجود کا سبب ہے اور شطرنج کا وجود شطرنج سیکھنے والے کے علم کا سبب ہے اسی طرح اشیاء کے متعلق اللہ کا علم سب سے مقدم اور ان سب کا سبب ہے اور ہمارا علم اس کے خلاف ہے۔ علم کی بدولت بندے کا شرف اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی صفات سے ہے لیکن سب سے زیادہ شریف علم وہ ہے جس کا موضوع زیادہ شریف ہو اور سب سے زیادہ شریف اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی معرفت سب معرفتوں سے زیادہ افضل ہے بلکہ تمام اشیاء کی معرفت کو جو شرف حاصل ہے وہ اسی کے لیے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی معرفت ہے یا اس طریق کی معرفت ہے جو بندہ کو اللہ سے قریب کر دیتا ہے یا اس امر کی معرفت ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے قرب کا حصول آسان ہو جاتا ہے جو معرفت اس سے خارج ہو اس میں زیادہ بھلائی نہیں۔

اَلْقَابِضُ، اَلْبَاسِطُ جل جلالہ:

(بندوں کی روزی محدود کرنے والا، بندوں کی روزی فراخ کرنے والا)، یہ اس معبود حقیقی کے دونوں نام ہیں جو موت کے وقت جانوں کو جسموں سے قبض کرتا ہے۔ زندگی کے وقت جسموں میں جانیں ڈالتا ہے اور اغنیاء سے خیراتیں بند کرلیتا ہے۔ محتاج لوگوں کے لیے رزق وافر کر دیتا ہے اور اغنیاء کے لیے رزق کشادہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ ان کو کبھی فاقہ کرنے کا موقعہ نہیں پڑتا، فقیروں کو تنگدست بنا دیتا ہے یہاں تک کہ بے چارے عاجز آجاتے ہیں۔ وہ دلوں کو قبض کرتا ہے اور اپنی بے پرواہی، بزرگی اور جلال کا پورا پورا احساس دلا کر ضیق میں ڈالتا ہے اور پھر اپنے لطف و احسان اور جمال کے فیضان سے ان پر بسط کی حالت طاری کر دیتا ہے۔ بندوں میں قابض و باسط وہ شخص ہے جس کو خدا کی طرف سے عجیب عجیب حکمتیں اور جامع کلمات عطا ہوئے ہوں پس کبھی تو وہ خدا کی نعمتوں اور عنایتوں کا حال سنا کر لوگوں کے دل باغ باغ بنا دیتا ہے۔ اور کبھی اس کے جلال اور کبریائی اور اس کے عذاب و بلا کے اقسام اور اپنے دشمنوں سے اس کے انتقام کا حال سنا کر ڈرائے اور ان کے دل میں سنسنی ڈال دے۔

اَلْخَافِضُ، اَلرَّافِعُ جل جلالہ:

(نافرمانوں کو پست کرنے والا۔ فرمانبرداروں کو بلند کرنے والا)، ان ناموں سے مراد وہ موجود برحق ہے جو کفار کو بدبختی میں مبتلا کر کے پست کر دیتا ہے اور مومنوں کو کامیابی بخش کر بلند کر دیتا ہے اپنے اولیاء کو قرب کی بلندی بخشتا ہے اور اپنے دشمنوں کو دوری کے گڑھے میں ڈالتا ہے جو شخص محسوسات اور متخیلات سے

اپنا مشاہدہ اور بری خواہشات سے اپنا ارادہ بلند کر لیتا ہے اور اس کو وہ موجود برحق ملائکہ مقربین کے مقام تک ترقی عطا کرتا ہے اور جو شخص اپنا مشاہدہ محسوسات پر اور اپنی ہمت کو ان خواہشات نفسانی پر جن میں چوپائے بھی اس کے شریک ہیں مائل رکھتا ہے تو اس کو وہ اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے اور یہ کام خاص خداوند تعالیٰ کے لیے ہیں لہٰذا وہ خافض اور رافع ہے۔

ان اسموں سے بندہ کا یہ حصہ ہے کہ حق کو بلند اور باطل کو پست کرے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے، حق بات کہنے والے کی تائید کرے اور غلط بات کرنے والے کو دھمکا دے۔ خدا کے دشمنوں سے دشمنی کرے تا کہ ان کو پست کرے اور خدا کے دوستوں سے دوستی رکھے تا کہ ان کو عالی رتبہ ہونے میں مدد کرے اس لیے اللہ نے اپنے کسی ولی سے فرمایا کہ تم نے دنیا میں زہد کیا تھا اس کے عوض میں تم کو راحت مل گئی اور مجھ کو جو یاد کیا تو میرا دیدار بھی حاصل ہو گیا، اب یہ بتاؤ کہ تم نے میرے کسی دوست سے دوستی اور میرے کسی دشمن سے دشمنی بھی کی۔

اَلْمُعِزُّ، اَلْمُذِلُّ جَلَّ جَلَالُهٗ:

(عزت دینے والا، ذلت دینے والا)، اور دونوں نام اس ذات پاک کے ہیں کہ جس کو چاہے بادشاہی دے جس سے چاہے چھین لے، سچی بادشاہی یہ ہے کہ محتاجی کی ذلت اور شمولیت کی مجبوری اور نادانی کے عیب سے نجات حاصل ہو پس اس نے جس شخص کے دل کا پردہ اٹھا دیا یہاں تک کہ اس نے اس ذات والا صفات کے جمال کا نظارہ کر لیا اور اس کو قناعت کی توفیق بخشی یہاں تک کہ وہ اس کی بدولت مخلوق سے بے پرواہ ہو گیا اور اس کو قوت و طاقت بخشی یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کی صفات پر غالب آ گیا تو اس کو اس جہان میں بھی عزت اور بادشاہی عطا کی اور پھر عاقبت میں بھی تقرب کی عزت بخشے گا اور جو شخص مخلوق پر نظر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا محتاج بن جاتا ہے اور اس پر اس قدر حرص غالب ہو جاتی ہے کہ وہ کسی حد تک قناعت نہیں کرتا اور جہالت کے اندھیرے میں پڑا رہتا ہے اس کو خدا نے بالکل ذلیل کر دیا اور اس سے ملک چھین لیا یہ خدا کے کام ہیں جس طرح چاہے کرے وہی عزت دینے والا ہے وہی ذلت دینے والا ہے جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔

اَلسَّمِیْعُ جَلَّ جَلَالُهٗ:

(بہت سننے والا)، سمیع وہ ذات ہے جس کے ادراک سے کوئی سننے کی بات مخفی نہیں رہتی خواہ باریک سے باریک ہو وہ رات کے وقت پتھر پر چلنے والی چیونٹی کے پاؤں کی آہٹ بھی سنتا ہے۔ حمد کہنے والوں کی حمد سن کر خیر دیتا ہے۔ دعا کرنے والوں کی دعائیں سن کر قبول کرتا ہے اس کی شنوائی کانوں اور کان کے پردوں کے بغیر ہی ہے جس طرح کہ اس کے دوسرے افعال بلا اعضاء اور کلام بے زبان کے ہیں اور اس کی شنوائی حدوث و تجدد سے پاک ہے جب تم کو یہ معلوم ہو چکا ہے اس کی شنوائی ایسے تغیرات سے پاک ہے جو مسموعات کے تازہ وقوع کے وقت عارض ہو سکتے ہیں اور تم نے اس کو اس امر سے منزہ سمجھ لیا ہے کہ وہ کان یا کسی دوسرے آلہ سے سنتا ہو، تو تم آپ سے آپ نتیجہ نکال سکتے ہو، کہ اس کی شنوائی کیا ہے۔ ایک صفت ہے جس سے اشیاء کی صفات کو پوری کی پوری ماہیت اس پر منکشف ہو جاتی ہیں جو شخص اس امر پر غور نہیں کرتا وہ تشبیہ کے خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے تم اس سے بچو اور ذرا غور و فکر سے کام لو بندہ کو حس کی حیثیت سے شنوائی کا جو حصہ حاصل ہے وہ ناقص ہے کیونکہ وہ تمام مسموعات کو ادراک نہیں کر سکتا بلکہ صرف انہیں آوازوں کو محسوس کر سکتا ہے جو اس کے قریب ہوں پھر یہ کہ اس کا ادراک ایک عضو کے ذریعہ سے ہے اور وہ ایک ایسا آلہ ہے جو مختلف آفات میں گھرا ہوا ہے۔ اگر آواز دھیمی ہو تو وہ ادراک کر نہیں سکتا اور دور ہو تو بھی سن نہیں سکتا۔ اگر آواز بڑی ہو تو شنوائی کا پردہ ہی پھٹ جاتا ہے، اور شنوائی باطل ہو جاتی ہے۔ شنوائی سے بندہ کا دینی حصہ دو امر ہیں، ایک تو یہ کہ وہ اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ سمیع ہے، لہٰذا اپنے کلام زبان کو بے ہودہ اور لغو بات اور ناجائز کلمات سے محفوظ رکھے دوم یاد رکھے کہ اس کو سننے کی طاقت اس لیے دی گئی ہے کہ خدا کا کلام جو اس نے نازل فرمایا ہے سنے اور اس کے ذریعہ سے خدا کی راہ پر چلنے کی ہدایت حاصل کرے غرض اس کے سوا اور کسی بات میں اپنی شنوائی استعمال نہ کرے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر معاملہ میں جو بات مطابق قرآن ہو اس کو قبول کرے اور اس کے خلاف سے اجتناب کرے۔

اَلْبَصِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(بہت دیکھنے والا)، یہ وہ ذات پاک ہے جو ہر چیز کو صاف صاف دیکھ رہا ہے یہاں تک کہ مٹی میں چھپی ہوئی چیزیں بھی اس کی نظر سے مخفی نہیں ہیں اس کا دیکھنا بھی پتلی، ڈھیلے اور پپوٹے وغیرہ سے پاک ہے اور اس معنیٰ سے بری ہے کہ اس ذات میں اشیاء کی صورتیں اور رنگ منطبع ہوتے ہوں، جیسے انسان کی آنکھ میں منطبع ہوتے ہیں کیونکہ یہ امور ان تاثرات اور تغیرات کے قبیل سے ہیں، جو تجدد و حدوث کے مقتضی ہیں جب وہ ان امور سے پاک ہے تو اس کا دیکھنا ایک ایسی صفت ہے جس سے دیدنی اشیاء کی ٹھیک ٹھاک صفات منکشف ہو جاتی ہیں اور یہ بینائی اس بینائی سے کہیں زیادہ اور روشن اور تیز ہے جو آنکھوں کو حاصل ہے اور جو اکثر صاف اور ظاہر چیزوں کو محسوس کرنے سے بھی قاصر رہتی ہے۔

وصف بصر میں سے حس کی حیثیت سے جو حصہ بندہ کو حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن وہ ضعیف و قاصر ہے کیونکہ اس کی طاقت دور تک کام نہیں کرتی اور نہ اشیاء میں جاتی ہے بلکہ صرف ظاہری اشیاء کو محسوس کرتی ہے چھپی ڈھکی باتوں سے قاصر ہے۔ دینی حصہ دو چیزیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ یقین رکھے کہ اس کی بینائی اس لیے دی گئی ہے کہ خدا کی نشانیوں اور عجائبات ملکوت اور آسمان پر نظر کرے تاکہ اس کو عبرت حاصل ہو، کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا مخلوق میں سے کوئی شخص آپ جیسا ہوگا آپ نے فرمایا: ہاں جس شخص کی نظر عبرت کے لیے ہو، اور خاموشی غور و فکر کے لیے اور کلام خدا کے ذکر کے لیے وہ مجھ جیسا ہے، دوم یاد رکھے کہ وہ ہر وقت خدا کی یاد میں ہے، لہٰذا اس کی نظر سے بے پروائی نہ کرے جو شخص لوگوں سے ایسی باتیں چھپاتا ہے وہ گو باخدا کی نظر سے بے پروائی کر رہا ہے اس صفت پر ایمان لانے کا ایک ثمرہ مراقبہ ہے پس جو شخص جانتا ہے کہ اس کو خدا دیکھ رہا ہے اور پھر کسی گناہ کے قریب جاتا ہے وہ کیسا دلیر اور گستاخ ہے اور اگر یہ گمان رکھتا ہے کہ خدا نہیں دیکھتا تو وہ کتنا بڑا کافر ہے۔

اَلْحَکَمُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(مخلوقات کا حاکم)، حکم وہ حاکم ہے جو لوگوں کے فیصلے کرتا ہے اور جس کے آگے سب مخلوقات سرِ تسلیم خم کرتی ہے، جس کے حکم کو کوئی نامنظور نہیں کر سکتا، اور نہ اس کے فیصلہ کو کوئی واپس کر سکتا ہے، جس کا بندوں کے حق میں یہ حکم ہے۔ **لیس للانسان الا ماسعی سعیۂ سوف یری** یعنی انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کمایا اور اس کی کمائی عنقریب دیکھ لی جائے گی، ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم، یعنی بھلے لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور برے لوگ دوزخ میں، بھلے اور برے لوگوں کے متعلق خوش قسمتی اور بدبختی کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے بھلائی اور برائی کو بھلے اور برے لوگوں کی سعادت اور شقاوت کا سبب بنا دیا ہے جیسے کہ دوائیں اور زہروں کو ان کے کھانے والوں کے لیے شفاء اور موت کا باعث بنا دیا ہے، چونکہ حکمت کا معنی اسباب پر مسببات کو مرتب کرتا ہے لہٰذا خداوند تعالیٰ حکم مطلق ہے چونکہ حکمت مطلق ہے کیونکہ وہی تمام اسباب مہیا کرتا ہے، حکم سے قضاء قدر کے معنی پیدا ہوتے ہیں، دیکھو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ اسباب وضع کرتا ہے تاکہ وہ مسببات تک منتہی ہوں پھر ان کلی اور اصلی ثابت و مستقر اسباب کو جو نہ زائل ہوتے ہیں اور نہ متغیر ہوتے ہیں نصب کرنا قضا ہے جیسے کہ زمین و آسمان ستارے اور ان کی حرکات جو متناسب اور دائم ہیں، نہ ان میں تغیر آتا ہے اور نہ وہ آگے پیچھے ہوتی ہیں یہاں تک کہ اس کا تحریری حکم اپنی میعاد کو پہنچ جائے گا۔ چنانچہ فرمایا: **فقضھن سبع سموت فی یومین واوحی فی کل سمآء امرھا** یعنی پس کر دیا دو دن میں سات آسمان اور ہر آسمان کو اس کا امر وحی کیا پھر ان متناسب و محدود اور مقدور محسوب اسباب کو ان مسببات کی طرف متوجہ کرنا قدر ہے جو ان اسباب سے لحظہ بہ لحظہ حادث ہوتے ہیں غرض کہ حکم وہ فیصلہ اور کلی تدبیر اور چوٹی کا امر ہے جو آنکھ کے جھپکے سے بھی جلد وقوع پا جاتا ہے۔ اور قضا اسباب کلیہ و دائمہ کا اصولی طور پر وضع کرنے کا نام ہے اور قدر سے مراد ان اسباب کلیہ کو ایک متناسب اور محسوب رفتار کے محدود و معدود مسببات کی طرف ایسے اندازہ کے ساتھ تحریک دینا ہے، جو کم و بیش نہ ہو اس لیے کوئی چیز اس کے قضاء و قدر سے باہر نہیں نکل سکتی اور یہ بات ذیل کی مثال سے بخوبی سمجھ آ سکتی ہے۔

اَللَّطِيفُ جَلَّ جَلَالُهُ:

(باریک بین) اس اسم کی مستحق وہ ذات ہے جو مصلحتوں کی باریک باریک باتیں جانے اور ان کو ان کے مستحق کی طرف سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے پہنچائے جب فعل میں نرمی اور علم میں باریک بینی جمع ہو جائے تو لطف کے معنی پورے ہو جاتے ہیں اور اس کا کمال علم و عمل میں خاص خدا کے لیے متصور ہے، خدا کا باریک اور دقیق باتوں پر جس قدر احاطہ ہے اس کی تفصیل ہو نہیں سکتی بلکہ ہر مخفی بات اس کے علم میں ویسی ہی ظاہر ہے جیسے کھلی بات، کچھ بھی فرق نہیں افعال میں اس کی نرمی اور مہربانی بھی شمار میں نہیں آسکتی کیونکہ فعل کی مہربانی کو وہی سمجھ سکتا ہے، جو اس کے تمام افعال کی تفصیل بھی جانتا ہو اور اس میں مہربانی کے نکتے سمجھتا ہو، جس قدر وہ ان کو جانتا ہوگا، اس قدر وہ لطیف کے معنی سمجھتا ہوگا، اس بات کی شرح بڑا طول چاہتی ہے اور امید نہیں کہ کئی دفتر اس کے دسویں حصہ کو بھی کافی ہو سکیں ہاں اس کی بعض باتوں کا اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ خدا کے بے انتہا لطفوں میں سے ایک لطف یہ ہے کہ وہ جنین کو ماں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا اور ناف کے ذریعہ غذا پہنچاتا ہے، یہاں تک کہ وہ متولد ہوتا ہے تو منہ سے کھانے لگتا ہے، تولد کے وقت خدا اس کو سکھا دیتا ہے کہ پستان کو منہ میں پکڑے اور چوسے خواہ رات کا اندھیرا ہو نہ اور کوئی اس کو سکھاتا ہے اور نہ وہ کسی کو اس طرح کرتے دیکھتا ہے بلکہ وہ انڈے کو توڑ کر چوزہ نکالتا ہے اور اس کو دانے چگنے سکھاتا ہے، پھر یہ کہ وہ اس کے پیدا ہونے کے وقت دانت نہیں بناتا کیونکہ ابھی دودھ پینے کی عمر میں دانتوں کی ضرورت نہیں پڑتی پھر جب اس کے بعد طعام چبانے کے لیے دانتوں کی ضرورت پڑتی ہے، تو دانت اُگاتا ہے، وہ کئی طرح کے دانت بناتا ہے، بعض ان میں سے طعام کو پیسنے کے لیے ہیں اور ایک کچلیاں ہیں جو توڑنے کی غرض سے ہیں اور ایک سامنے کے دانت ہیں جو کاٹنے کی خاطر ہیں پھر یہ کہ وہ زبان وجس سے ظاہری غرض کلام ہے طعام کو دانتوں کی چکی میں ڈالنے کے کام پر مامور کرتا ہے، ایک لقمہ کے میسر ہونے کے متعلق خدا کی مہربانی کا مفصل ذکر کیا جائے جو بندہ کو بلا مشقت ہاتھ آتا ہے، اور جس کی اصلاح اور تکمیل میں ایک مخلوق نے جس کا شمار نہیں ہو سکتا مدد دی ہے، کسی نے زمین کو درست کیا کسی نے بیج بویا کسی نے پکایا کسی نے فصل کو کاٹا، کسی نے کھلیان سے غلہ نکالا کسی نے اس کو گوندھا کسی نے پکایا وغیرہ وغیرہ تو اس کی تفصیل اختتام کو پہنچی، الغرض اللہ تعالیٰ اس حیثیت سے کہ اس نے امور کی تدبیر کی ہے حکم ہے اور اس حیثیت سے کہ ان کو ایجاد کیا جواد ہے اور اس حیثیت سے کہ ان کو ترتیب دی مصور ہے اور اس حیثیت سے کہ ہر چیز کو اس کے مقام مناسب میں رکھا ہے، عدل ہے اور اس حیثیت سے کہ اس میں نرمی کی وجوہ کی کوئی باریکی نہیں چھوڑی لطیف ہے اور جو شخص ان افعال کی حقیقت نہیں سمجھتا وہ ان اسماء کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتا، بندوں پر اس کا ایک لطف یہ ہے کہ اس نے ان کو کفایت سے زیادہ توفیق دی ہے، اور طاقت سے کم مجبور کیا ہے۔ ایک لطف یہ ہے کہ تھوڑی سے بہت یعنی دنیوی عمر میں خفیف کوشش کرنے پر ان کو ابدی سعادت حاصل کرنے کی توفیق دی ہے، کیونکہ اس عمر کو ابد کے ساتھ کچھ بھی نسبت نہیں ایک لطف یہ ہے کہ وہ لید اور خون میں سے صاف دودھ اور سخت پتھروں سے نفیس جواہر اور مکھی سے شہد اور کیڑے سے ریشم اور سیپ سے موتی پیدا کرتا ہے۔ ان سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ انسان کو گندے نطفے سے پیدا کر کے اس کو اپنی معرفت کا خازن اپنی امانت کا حامل اور آسمانوں کے عجائبات کا نظارہ دیکھنے والا بناتا ہے اور یہ بھی وہ لطف ہے جو شمار میں نہیں آسکتا۔

اس وصف سے بندے کا خاص حصہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے۔ خدا کی طرف بلانے اور سعادت آخرت کی ہدایت کرنے میں ان کے ساتھ ملائمت کرے بلا اس کے کہ تحقیر سختی لڑائی اور تعصب کرے۔ سب سے اچھا لطف جس میں قبول حق کی ایک کشش موجود ہوتی ہے وہ پاک عادات اچھے خصائل اور نیک اعمال ہیں کیونکہ چکنی چپڑی باتوں کی نسبت یہ امور زیادہ موثر اور پر لطف ہوتے ہیں۔

اَلْخَبِيرُ جَلَّ جَلَالُهُ:

(آگاہ، دانا، عالم، عارف) خبیر وہ ہے جس سے کوئی باطنی خبر مخفی نہیں۔ عالم سفلی اور عالم بالا میں کوئی بات ہو کوئی ذرہ حرکت کرے یا ساکن ہو، کوئی جان بے قرار ہو یا مطمئن ہو اس کو ہر بات کی خبر ہوتی ہے اور معنیٰ کی رو سے علیم ہے لیکن علم کو جب باطنی بھیدوں سے منسوب کیا جائے، تو وہ خبرۃ کہلاتا ہے۔ خبرۃ والے کو خبیر کہتے ہیں۔

اس اسم سے بندہ کا حصہ یہ ہے کہ وہ ہر بات سے جو اس کے اپنے بدن اور قلب کے عالم میں جاری ہوتی ہو خبر رکھتا ہو، جن چھپی ڈھکی برائیوں سے متصف ہو جاتا ہے، مثلاً ہر باطنی خیانت دنیائے دوں کے لیے ہر وقت مارے مارے پھرنا برائی کی نیت رکھنا اور بھلائی ظاہر کرنا اخلاص ظاہر کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دینا اور اندر کچھ بھی نہ ہونا ان کو پوری خبرۃ والا آدمی ہی معلوم کرتا ہے، جو اپنے نفس کا خوب امتحان لیتا رہا ہو، اور اس کے مکر و تلبیس اور فریب کو اچھی طرح تاڑ تا رہا ہو اور اس کے مقابلہ اور مخالفت کے لیے کمر بستہ ہو جائے اور اس سے بچنے لگے ایسا بندہ خبیر کہلانے کا پورا مستحق ہے۔

اَلْحَلِیْمُ جل جلالہ:

(بردبار) حلیم وہ ذات ہے، جو نافرمان لوگوں کی نافرمانی اور اپنے حکم کی مخالفت ہوتے دیکھے پھر بھی وہ غضب میں بے قرار نہ ہو نہ اس کو غصہ عارض ہو اور باوجود پورے اقتدار کے وہ بے حوصلگی کے ساتھ انتقام لینے میں جلدی نہ کرے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **ولو یواخذ اللہ الناس بما کسبو ماترك علی ظهرها من دابة** ۔ یعنی اگر خدا لوگوں کی بداعمالیوں پر گرفت کرنے لگے تو روئے زمین پر کسی جاندار کو زندہ نہ چھوڑے۔ حلیم کے وصف سے بندہ کا حصہ ظاہر ہی ہے۔ اتنا سمجھ لو کہ حلم بندوں کے اچھے فضائل میں سے ہے جو شرح اور تفصیل کا محتاج نہیں۔

اَلْعَظِیْمُ جل جلالہ:

(بزرگ، بڑا) واضح ہو کہ عظیم کا اسم اپنی وضع اول میں اجسام پر بولا جاتا ہے، چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ یہ جسم عظیم ہے۔ اور جب ایک جسم دوسرے جسم سے طول عرض اور عمق میں زیادہ بڑا ہو تو کہتے ہیں یہ جسم اس جسم سے اعظم ہے، اسم عظیم دو قسم کی اشیاء پر بولا جاتا ہے، ایک تو وہ شے جو ساری کی ساری نظر آ جاتی ہے

دوسری وہ جس پر پورے طور سے نگاہ کا محیط اور حاوی ہونا متصور نہ ہو سکے جیسے زمین آسمان وغیرہ دیکھو ہاتھی ایک عظیم مخلوق ہے، پہاڑ بھی ایک عظیم شے ہے لیکن یہ چیزیں نگاہ میں پوری پوری سما سکتی ہیں لہٰذا وہ اپنے نیچے کی اشیاء کے مقابلہ میں عظیم ہیں، اور زمین کے نسبت یہ امر متصور بھی نہیں ہوسکتا، کہ نگاہ ہر سمت سے اس پر حاوی ہو سکے، یہی حال آسمان کا ہے، پس یہ چیزیں مدرکات بصر میں مطلقاً عظیم ہیں، مدرکات بصیرت (جو باتیں عقل میں آ سکتی ہیں) ان میں بھی بڑا تفاوت ہے بعض اشیاء کی کنہ وحقیقت پر محیط ہونے سے عقل قاصر ہے ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جن پر بعض عقول کا حاوی ہونا متصور ہو سکے اگر چہ اکثر عقول ان سے قاصر ہوں، دوم وہ جن کا عقل کے احاطہ میں آنا حقیقتاً کسی طرح متصور ہو ہی نہ سکے اور یہ وہ عظیم مطلق ہے۔ جو تمام عقول کی حدود سے بڑھا ہوا ہے یہاں تک کہ اس کی حقیقت اور بھید کو پانا تصور میں آ سکتا ہی نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ ہے یہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، بندوں میں سے عظیم انبیاء وعلماء ہیں۔

جن کی تھوڑی سی صفات کا بھی اگر کوئی عقل مند تصور کرتا ہے تو ہیبت ورعب سے اس کا سینہ بھر جاتا ہے اور دل میں ان کی عظمت کے خیال کے سوا اور کسی بات کی گنجائش نہیں رہتی، اس لحاظ سے ہر نبی اپنی امت کے حق میں اور شیخ اپنے مرید کے حق میں اور استاد اپنے شاگرد کے حق میں عظیم ہے، کیونکہ عقل اس کی صفات کے احاطہ سے قاصر ہے تو اگر وہ اس کے برابر ہو جائے یا اس سے بڑھ جائے تو بھی اس کی طرف اضافت کرنے سے عظیم نہیں کہلائے گا، جو عظیم خدا کے سوا کسی اور چیز کے لیے فرض کیا جائے وہ ناقص ہے، ایسا عظیم عظیم مطلق نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کی عظمت ایک شے چھوڑ کر دوسری شے کی طرف اضافت کرنے سے ظاہر ہوتی ہے، بخلاف خدا کی عظمت کے، کیونکہ یہ عظیم مطلق ہے بطریق اضافت عظیم نہیں۔

اَلْغَفُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(بہت بخشنے والا) یہ اسم غفار کا ہم معنی ہے لیکن اس میں ایک قسم کا مبالغہ پایا جاتا ہے جو غفار میں نہیں کیونکہ غفار کا مبالغہ متکرر منفرد کے لحاظ سے ہے چنانچہ فعال کا صیغہ کثرت فعل پر دال ہے اور فعول کا صیغہ فعل کی عمدگی اور کمال اور وسعت پر دلالت کرتا ہے پس وہ غفور ہے۔ بایں معنی کہ وہ پوری اور مکمل غفران والا ہے۔ حتی کہ وہ مغفرت کے انتہائی درجوں کو پہنچا ہوا ہے، اس کے متعلق بھی اولاً ذکر ہو چکا ہے۔

اَلشَّکُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

شکور وہ ہے جو تھوڑی سی طاعت کے عوض میں بہت سے درجے عطا فرماتا ہے، اور چند روزہ عملوں کے بدلے آخرت میں غیر محدود نعمتیں دیتا ہے اور جو کوئی نیکی کی کئی گنا عوض دیوے اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس نے اس نیکی کا شکر کیا اور جو کوئی محسن کی تعریف کرے تو اس نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔ اگر عوض وجزا کی زیادتی کے معنی کا لحاظ کرو تو اللہ تعالیٰ کے سوا شکور مطلق کوئی کوئی کیونکہ وہ عوض میں جس قدر زیادہ دیتا ہے اس کا شمار نہیں ہے، دیکھو بہشت کی نعمتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ **کلوا واشربوا هنيئًا بما اسلفتم في الايام الخالية** یعنی خوب مزے کے ساتھ کھاؤ پیو بعوض ان عملوں کے جو تم نے گزشتہ ایام میں کئے اور اگر تم تعریف کے معنی کا لحاظ کرو تو خدا کے سوا کسی چیز کی تعریف کرنے والے کی تعریف خدا ہی کی تعریف بن جاتی ہے اور پروردگار جب اپنے بندوں کے عملوں کی تعریف کرتا ہے تو اپنے ہی فعل کی تعریف کرتا ہے، کیونکہ ان کے اعمال اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر وہ شخص شکور کہلا سکتا ہے جو کچھ ملے اور شکر کرے تو وہ ذات جو بندہ کو عطا بھی کرے اور بندہ ہی کا شکریہ ادا کرے وہ تو شکور کہلانے کی نہایت ہی حقدار ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی جو تعریف کرتا ہے وہ اس قسم کی ہے جیسے **والذاكرين الله كثيراً والذاكرات** یعنی اور بہت یاد کرنے والے اللہ کو اور یاد کرنے والیاں اور جیسے **نعم العبد انه اواب:** یعنی کیا اچھے بندے تھے کہ بات بات میں خدا کی طرف رجوع کرتے تھے، وغیرہ اور یہ تمام خدا کا عطیہ ہے بندہ دوسرے بندے کے حق میں شاکر یوں ہو سکتا ہے کہ کبھی اس کے احسان پر اس کی تعریف کرے اور کبھی اس کی نیکی کا کئی گنا عوض دے، اور یہ بات اچھی خصلتوں میں سے ہے کہ رسول کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: **من لم يشكر الناس لم يشكر الله۔** جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا، وہ خدا کا شکریہ کب ادا کرے گا، خدا کے حق میں اس کا شکر بہر صورت مجاز اور توسع کی قسم سے ہوگا کیونکہ اگر وہ تعریف کرے گا تو اس کی پوری تعریف نہ ہو سکے گی، اگر اس کی اطاعت کرے گا تو اس کی

اطاعت خود اللہ کی ایک دوسری نعمت ہے بلکہ قابل شکر نعمت کے علاوہ عین اس کا شکر بھی ایک دوسری نعمت ہے، اللہ کی نعمتوں کے شکر کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان کو اس کی نافرمانیوں میں استعمال نہ کرے بلکہ اس کی اطاعت کے کام میں لادے اور یہ بھی خدا کی توفیق اور رہنمائی کے ساتھ ہے، بندہ کے شاکر ہونے میں (اور اس بات کے تصور میں ایک باریک نکتہ ہے جس کو کتاب میں بیان کیا جائے گا)۔

اَلْعَلِیُّ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(بہت اونچا)، علی وہ ہے جس کے رتبے سے بڑا کوئی رتبہ نہیں اور اس کے مرتبہ سے تمام مراتب نیچے ہوں، اور یہ اس لیے کہ علی علو سے مشتق ہے اور یہ اس علو (بلندی) سے ماخوذ ہے جو سفل (پستی) کا مقابل ہے اور وہ یا تو محسوس درجوں میں ہوتا ہے، سیڑھیوں اور زینوں میں ان تمام اجسام میں جو ایک دوسرے سے نیچے اوپر ہوں اور یا موجودات کے عقلی مراتب میں ہوں جو ایک قسم کی عقلی ترتیب سے مرتب ہوں، پس جس چیز کو مکان کی فوقیت ہو اس کو علو مکانی ہے، اور جس کو مرتبہ کی فوقیت ہے اس کو مرتبہ کا علو ہے، اور عقلی درجات حسی درجات عقلیہ کی مثال وہ تفاوت ہے، جو سبب ومسبب اور علت ومعلول اور فاعل ومفعول اور قابل ومقبول اور کامل وناقص کے مابین ہوتا ہے چنانچہ تم ایک سبب فرض کرو تو وہ دوسری شے کا سبب ہو اور دوسری شے تیسری کا سبب ہو اور تیسری چوتھی کا اور مثلاً یہ سلسلہ دس درجوں تک چلا جائے تو دسویں شے آخری رتبہ میں واقع ہوگی لہٰذا وہ سب سے اسفل ہے اور پہلا جو دوسرے سے اوپر ہوگا، تو یہ فوقیت معنوی ہے، مکانی نہیں اور علو سے مراد فوقیت ہے، تدریج عقلی کے معنی سمجھنے کے بعد واضح ہو کہ موجودات کی تقسیم تفاوت درجات میں عقل کی رو سے جس طرح بھی کی جائے اللہ تعالیٰ تمام اقسام کے درجوں سے بالاتر رہتا ہے یہاں تک کہ اس سے برتر کوئی درجہ تصور میں بھی نہیں آسکتا وہ علی مطلق ہے جو اس کے سوا ہیں وہ اپنے سے نیچے والوں کی طرف سے نسبت کرنے سے علی بین اور اوپر والوں کے مقابلے میں سافل اور گھٹیا ہیں عقل کی تقسیم کی مثال یہ ہے، کہ موجودات سبب اور مسبب پر منقسم ہیں، مسبب سبب سے ایک درجہ اوپر ہے، پس مطلق فوقیت صرف مسبب الاسباب کا حصہ ہے، اسی طرح موجودات مردہ اور زندہ میں منقسم ہے اور زندہ مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جن کو صرف حسی ادراک حاصل ہے اور وہ حیوان ہے اور دوسرے وہ جن کو حسی ادراک کے ساتھ عقلی ادراک بھی حاصل ہے اور وہ حیوان ہے اور دوسرے وہ جن کو حسی ادراک کے ساتھ عقلی ادراک بھی حاصل ہے اور ادراک عقلی والی موجودات کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کی معلومات میں شہوت اور غضب رکاوٹ ڈالیں اور وہ انسان ہے پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کی معلومات میں شہوت اور غضب رکاوٹ ڈالیں اور وہ انسان ہے دوسرے وہ جن کا ادراک مکدرات کے معارضہ سے پاک ہے، اس آخری قسم کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا ان مکدرات میں مبتلا ہونا ممکن ہے لیکن ہمیشہ سلامتی ہی حاصل رہی ہو جیسے کہ فرشتے، دوسری قسم میں وہ ذات ہے جس کے حق میں ایسی باتیں محال ہیں، او وہ خدا ہے، اس تقسیم میں تم کو معلوم ہو گیا ہوگا، کہ فرشتہ انسان سے اوپر ہے اور انسان حیوان سے اوپر اور خدا سب سے اوپر، پس وہ علی مطلق ہے کیونکہ وہ خود زندہ اور جہان کو زندہ کرنے والا ہے اور علماء کے علوم کو پیدا کرنے والا اور پاک اور ہر قسم کے عیوب سے منزہ ہے ادھر بے جان چیز درجات کمال میں سب سے نیچے کے درجہ میں واقع ہوئی ہے، انتہائی رتبے میں خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے غرض اسی طرح اس کی فوقیت اور علو کو سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ نام پہلے ادراک بصر کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہیں، اور یہ عوام کا درجہ ہے پھر جب خواص لوگ عقلی ادراکات سے بہرہ ور ہوئے اور ان کو آنکھ کے ادراک اور عقل کے ادراک میں موازنہ محسوس ہوا تو اس سے مطلق الفاظ بطور استعارہ اخذ کر لیے جن کو خواص نے سمجھ لیا اور عوام نے نہیں سمجھا جن کا ادراک حواس ظاہری سے آگے ترقی نہیں کر سکتا جو جانوروں کا درجہ ہے چنانچہ وہ کسی عظمت کا تصور محض طول عرض کی رو سے اور علو کا تصور ظرف مکانی کی رو سے سمجھتے ہیں، اس بیان سے تم خدا کے عرش کے اوپر ہونے کا مطلب سمجھ گئے ہوگے، کیونکہ وہ تمام اجسام سے بڑا ہے، گویا وہ تمام اجسام کے اوپر ہے اور وہ ذات موجود جو اجسام کی حدود ہونے اور مقادیر کے ساتھ مقتدر ہونے سے منزہ ہے وہ رتبہ میں مسبب کے سبب اجسام کے اوپر ہے، لیکن اس فوقیت کو عرش کے ساتھ جو ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ کہ عرش تمام اجسام سے بالا ہے، پس جو عرش سے بھی بالا ہوگا وہ سب سے بالا ہوگا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ خلیفہ سلطان کے اوپر ہے جس سے بتانا مقصود ہو کہ جب وہ سلطان سے بالا ہے تو ان تمام لوگوں سے بھی بالا ہوگا جو سلطان سے نیچے ہیں یا وہ گو آدمی جو فوق کے معنی صرف طرف مکان سمجھتا ہے واقعی ہمبنسی کے لائق ہے اور با ایں ہمہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ فلاں دو معزز شخص مجلس میں کس کس درجہ پر بیٹھتے ہیں تو اس کو کہنا پڑے گا کہ یہ شخص اس شخص سے اوپر بیٹھتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس کے دائیں جانب بیٹھتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس شخص کا اس شخص کے اوپر بیٹھنا یوں ہو سکتا تھا کہ اس کے سر پر بیٹھتا یا اس

جگہ پر بیٹھتا جو اس کے سر پر بنی ہوئی ہوتی پھر اگر اس کو کہا جائے کہ تم جھوٹ بولتے ہو وہ نہ اس کے اوپر بیٹھتا ہے نہ اس کے نیچے بلکہ اس کے پہلو پر بیٹھتا ہوگا تو وہ اس اعتراض سے آگ بگولا ہو کر کہے گا کہ تم بھی کیا آدمی ہو کہ کچھ کا کچھ سمجھ جاتے ہو، اجی اس فوقیت سے مراد رتبہ کی فوقیت اور صدر کا قرب تھا، نہ کہ سر پر یا سر سے اونچا بیٹھنا دیکھو صدر مدارج مجلس کا منتہی ہوتا ہے جو شخص صدر سے قریب ہے وہ اس شخص کے اوپر ہے جو صدر سے دور ہے اس بیان سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ جس ترتیب کی دو طرفین ہوں اس میں ایک طرف کو فوق اور علو سے اور دوسری کو اس کے مقابل کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

بندہ کا علی ہونا ممکن نہیں کیونکہ وہ جو درجہ حاصل کر سکتا ہے اس کے اوپر کوئی نہ کوئی درجہ ضرور ہوتا ہے اور یہ انبیاء و ملائکہ کے درجے ہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ بندہ کوئی ایسا درجہ حاصل کرے جو انسان کی جنس سے سب سے اونچا ہو اس کے اوپر کوئی درجہ نہ ہو، یہ درجہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے لیکن وہ علو مطلق کے مقابلہ میں قاصر ہے، پس علی مطلق وہ ہے جس کو بحسب وجوب فوقیت حاصل ہو نہ کہ بالاضافت اور نہ کہ بحسب وجود جس کے ساتھ نقیض کا امکان مقارن ہو۔

اَلْکَبِیْرُ جل جلالہٗ:

کبیر سے مراد صاحب کبریا، اور کبریا سے مراد ذات کمال ہے اور ذات کمال کے معنی کمال وجود اور کمال وجود میں، دو باتیں شامل ہیں، پہلی بات اس کا ازلی و ابدی دوام ہے پس وجود کے شروع میں عدم ہو یا آخر میں وہ ناقص ہے اور اسی لیے جب کسی انسان کی عمر دراز ہو جاتی ہے تو اس کو کبیر کہتے ہیں جس سے مراد کبیر السن یا لمبی عمر والا ہوتا ہے، بخلاف اس کے اس کو عظیم السن نہیں کہتے کبیر اس مقام میں استعمال ہوتا ہے جہاں عظیم استعمال نہیں کیا جاتا پس جب وہ شخص کبیر کہلاتا ہے، جس کے وجود کی مدت ایک محدود درجہ تک لمبی ہوتی ہے تو وہ ذات جو ازل سے ابد تک قائم و دائم ہے اور جس پر عدم کا طاری ہونا محال ہے وہ تو بطریق اولیٰ کبیر ہے، دوسری بات یہ کہ اس کا وجود وہ ہے جس سے ہر موجود کا وجود ہے، پس جس شے کا وجود فی نفسہٖ مکمل ہو جب وہ کامل اور کبیر ہو تو وہ ذات جس سے تمام موجودات کا وجود ہو سب سے پہلے کامل اور کبیر ہے۔

بندوں میں سے کبیر وہ شخص ہے جس کی صفات کمال صرف اس میں بند نہ ہوں بلکہ دوسروں پر بھی اثر کریں پس جس شخص کو اس کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے اس کو کچھ نہ کچھ اس کے کمال کا فیض پہنچے، بندہ کا کمال اس کی عقل، پرہیزگاری اور علم میں ہوتا ہے، پس کبیر وہ عالم اور پرہیزگار شخص ہے جو لوگوں کو ہدایت کرے اور اس قابل ہو کہ لوگوں کا پیشوا ہو جس کے نور اور علم سے لوگ روشنی حاصل کریں اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص صاحب علم ہو کر عمل بھی کرے وہ عالم بالا میں عظیم کہلاتا ہے۔

اَلْحَفِیْظُ جل جلالہٗ:

(بہت بڑی نگہبانی کرنے والے کو کہتے ہیں)، یہ معنیٰ لفظ کے معنی کو سمجھنے ہی سے سمجھ میں آسکتے ہیں، اور حفظ دو طرح پر ہے ایک تو موجودات کے وجود کو ہمیشہ قائم رکھنا اس کے مقابلہ میں اعدام ہے اور اللہ تعالیٰ آسمان زمین ملائکہ وغیرہ لمبی زندگی والی موجودات اور حیوانات اور نباتات وغیرہ چھوٹی عمر والی موجودات کا حافظ ہے، دوم حفظ کے زیادہ ظاہر معنی ہیں وہ متعدی اور متضاد چیزوں کو ایک دوسرے سے بچانا ہے اور اس متعدی سے وہ متعدی مراد ہے جو پانی اور آگ کے درمیان ہے کیونکہ وہ دونوں طبعاً ایک دوسرے کے مخالف اور ایک دوسرے پر تعدی کرنے والے ہیں، یا تو پانی آگ بجھا دیتا ہے، اور یا آگ پانی کی بخار کی صورت میں بدل کر ہوا بنا دیتی ہے اور حرارت و برودت کا باہمی تضاد اور معاندت ظاہر ہے جو ایک دوسرے کو دباتی رہتی ہیں۔ اس طرح رطوبت اور یبوست میں جو مخالفت ہے ظاہر ہے اور تمام اجسام ارضی انہیں مخالف ارکان سے مرکب ہیں، کیونکہ جاندار کے لیے حرارت عزیزی کا ہونا ضروری ہے اگر وہ نہ رہے تو زندگی نہ رہے اور رطوبت بھی ضروری ہے جو اس کے بدن کی غذا ہوتی ہے جیسے خون وغیرہ اور یبوست لازم ہے جس کے ساتھ اس کے اعضاء منضبط اور باہم پیوست اور چسپاں رہتے ہیں، خصوصاً اور اعضاء جو سخت ہیں جیسے ہڈی اور برودت بھی ضروری ہے جو حرارت کی تیزی کو کم کرے تاکہ وہ معتدل رہے اور باطنی رطوبتوں کو فوراً جلانے اور تحلیل کرنے نہ پائے یہ چاروں ارکان باہم متعادی اور متنازع ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کے چمڑے اور جاندار کے بدن اور نباتات کے جسم

میں اورتمام مرکبات میں جمع کر دیا ہے اگر وہ ان کی حفاظت نہ کرتا تو وہ باہم بگاڑ پیدا کر کے ایک دوسرے سے پھٹ جاتے اوران کا باہمی ترکیب اورامتزاج باطل ہوجاتا اوروہ معنی باطل ہوجاتا جس کوترکیب اورمزاج کے ساتھ قبول کرنے کے لیے وہ مستعد ہوا تھا، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت پہلے تو تعدیل قوی سے اور پھر امدادمغلوب سے کرتا ہے، تعدیل یہ ہے کہ مثلاً قوت بارد کا درجہ قوت حار کے برابر ہوتا کہ جب وہ دوہ دونوں جمع ہوں تو ایک دوسرے پر غالب نہ ہوسکیں بلکہ ایک دوسرے کی موافقت کریں، کیونکہ جب ان میں سے کوئی غالب نہیں ہوتی تومغلوب کون ہو پس وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کریں اوران کے مقابلہ اور برابری کے ساتھ ساتھ بدن کا قوام باقی رہے اس سے مراد اعتدال مزاج ہے، دوم مغلوب کو اس چیز کے ساتھ امداد دینا جس سے وہ اپنی طاقت تازہ کر کے غالب کا مقابلہ کرے مثلاً حرارت برودت کو فناہ کرتی اور سوکھاتی ہے پس جب وہ غالب آتی ہے، تو برودت، اور رطوبت کمزور ہوجاتی ہے اور حرارت اور یبوست غالب آتی ہے اور ضعیف کی امداد سرد وتر جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ پانی ہے، پیاس کا مطلب یہی ہے کہ سرد تر چیز کی ضرورت پیش آتی ہے پس اللہ تعالیٰ نے سرو تر اشیاء برورت اور رطوبت کی مدد کے لیے بنائی ہیں کہ جب ایک ان میں سے غالب ہو اس کی مخالف چیز کو مقابلہ میں کھڑا کر دیا جائے جس سے وہ دب جائے اور

یہ امداد ہے اور یہ غذا دوا کے بنانے سے اور اسے آلات وواز ار پیدا کرنے کرنے سے جو اس میں کام دیتے ہیں اوران کو استعمال کی توفیق عطا فرمانے سے یہ امداد تکمیل کو پہنچی ہے اور یہ تمام امور حیوانات اور متضاد اجزاء کے مرکبات کے بدنوں کی حفاظت کے لیے ہیں اور یہی اسباب ہیں جن کی بدولت انسان اپنے جسم کی داخلی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے جیسے خونخوار درندے اور جانی دشمن، پس ان سے محفوظ رکھتے کے لیے چند ایسے جاسوس پیدا کیے ہیں جو دشمن کے قریب آنے کی اطلاع دیتے ہین اور وہ اس کے مقدمۃ الجیش ہیں جیسے آنکھ کان وغیرہ پھر اس کے لیے طاقت ور ہاتھ اور اسلحہ عطا کئے ہیں جن میں سے بعض مدافعانہ کام دیتے ہیں جیسے زرہ اور ڈھال اور بعض جارحانہ جیسے تلوار چھری بندوق وغیرہ پھر بسا اوقات انسان دفع آفت سے عاجز آجاتا ہے، اس کو آلہ گریز سے مدددی ہے اور پاؤں سے چلنے والے جانوروں کے لیے پاؤں ہیں اور پرندے کئے لیے بازو ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ کی حفاظت عالم علوی اور عالم سفلی کے ذرے ذرے اور پتے پتے پر حاوی ہے، یہاں تک کہ میوے کے گودے کو سخت چھلکے اور پودے کی طراوت کو رطوبت کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے اور جو میوہ صرف چھلکے سے محفوظ نہ

رہے اس کی حفاظت کانٹوں کے ساتھ کرتا ہے جو اسی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، تا کہ ان سے بعض تلف کرنے والے جانداروں کا دفاع ہوتا رہے پس کانٹے نباتات کے ہتھیار ہیں جیسے حیوانات کے ہتھیار سینگ پنجے اور کچلیاں ہیں بلکہ پانی کے قطرہ قطرہ کے ساتھ حفاظت کے اسباب ہیں جو ان کو مخالف ہوا سے بچاتے ہیں، دیکھو اگر پانی کو کسی برتن میں کسی مدت تک پڑا رہنے دیا جائے تو وہ ہوا بن جاتا ہے اور ہوا اس سے تری کی صفت دور کر دیتی ہے، اگر تم پانی کے کسی برتن میں انگلی ڈبودو اور پھر اس کو نکال کر الٹی کرو تو اس سے ایک قطرہ نیچے لوڈھلک آئے گا، لیکن انگلی کے سرے پر آ کر رہ جائے گا، انگلی سے جدا نہ ہوگا، حالانکہ پستی کی طرف بہنا اس کا طبعی خاصہ ہے، اگر وہ بہ جائے تو چھوٹا ہونے کے باعث ہوا کے غلبہ سے فنا ہو جائے گا اسی لیے وہ برابر جھلکا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ باقی تری بھی شامل ہو جاتی ہے جس سے وہ ایک بڑا قطرہ بن جاتا ہے اور فوراً ہوا کو چیر ہوا نیچے گر جاتا ہے۔ ہوا اس کو اپنی جنس میں ملا لینے پر قادر نہیں ہو سکتی اور یہ اس کی حفاظت کی ایک صورت ہے جب کہ وہ کمزور اور اس کی مخالف یعنی ہوا طاقت ور ہوتی ہے، جب کہ اس کو تری کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، یہ حفاظت ایک فرشتے کی طرف سے ہوتی ہے جو اس پر مامور ہے محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مینہ کی ہر ایک بوند کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ بوند زمین میں اپنی قرار گاہ پر جا پہنچتی ہے، اور حق یہ ہے، ارباب بصائر کا باطنی مشاہدہ اسی پر دلالت کرتا ہے غرض اس حکم نبوی ﷺ پر نہ صرف تقلید کی رو سے یقین کرنا چاہیے، بلکہ از روئے عقل بھی اس کو درست ماننا چاہیے، خدا کا آسمان زمین اور ان کے درمیان اشیاء کو پیدا کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق بحث کا سلسلہ بڑا طول طویل ہے جیسے کہ باقی تمام افعال کے متعلق ہے اور اسی سے اس اسم کے معنی معلوم کئے جا سکتے ہیں، نہ صرف لغوی اشتقاق کے سمجھنے سے اور مجمل طور پر حفظ کے معنی معلوم ہو چکے۔

بندوں میں سے حفیظ وہ ہے جو اپنے اعضا اور دل کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے دین کو غضب کے حملے شہوت کے فریب نفس کے مکر اور شیطان کے دھوکے سے محفوظ رکھے کیونکہ وہ تباہی کے گڑھے کے قریب ہے، اور ان بربادی بخش مہلکات نے اس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔

اَلْمُقِيْتُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(مخلوق کو قوت یا روزی پہنچانے والا)، اس کے معنی ہیں غذاؤں کا پیدا کرنے والا اور بدنوں کی غذا یعنی کھانے کی چیزیں بدنوں تک پہنچانے والا اور دلوں کو غذا یعنی معرفت دلوں تک پہنچانے والا پس مقیت رازق کا ہم معنیٰ ہے لیکن اس کی نسبت خاص ہے، کیونکہ رزق غذا اور غذا کے سوا دوسری چیزوں کو شامل ہے، اور غذا وہ چیز ہے جو صرف قوام بدن کو کافی ہو سکے۔ مقیت (مستولی) غالب اور قادر کے معنوں میں بھی آتا ہے، استیلائے قدرت اور علم کے ساتھ پورا ہوتا ہے ان معنوں پر خداوند تعالیٰ کا یہ کلام دلالت کرتا ہے **وکان اللہ علی کل شئی مقیتاً**: یعنی اور اللہ ہر چیز پر مطلع اور قادر ہے، غرض اس لحاظ سے مقیت کے معنی میں قدرت اور علم کا مفہوم داخل ہے، علم کا بیان تو گزر چکا قدرت کا بیان آگے آئے گا، اس معنی کی رو سے خدا کی صفت مقیت صرف قادر کی نسبت اور صفت عالم کی نسبت زیادہ مکمل ہے کیونکہ وہ اکٹھے ان دونوں معنوں پر دال ہے اور اس جہت سے یہ اسم تراوف سے نکل گیا۔

اَلْحَسِيْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(کافی)، حسیب سے مراد ہے کافی اور یہ وہ ہے جو کوئی اس کا ہو جائے وہ اس کے لیے کافی ہو اور اللہ تعالیٰ سب کے لیے حسیب اور کافی ہے اس وصف کی حقیقت خدا کے سوا اور کسی کے لیے متصور نہیں ہو سکتی کیونکہ کفایت کے محتاج کو جو اس کی حاجت ہوگی تو اپنے وجود اور دوام وجود اور کمال وجود کے لیے ہوگی، اور خدا کے سوا ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے، جو تنہا کسی چیز کے لیے کافی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے لیے کافی ہے، نہ صرف اشیاء کے لیے یعنی وہ اکیلا ہی کافی ہے، کہ اس کے ساتھ اشیاء کا وجود متحصل ہو اور اس کے ساتھ ان کا وجود ہمیشہ رہے اور اس کے ساتھ ان کا وجود مکمل ہو اور تم کو یہ ظن بھی نہیں کرنا چاہیے کہ جب تم کھانے پینے کی اور زمین آسمان اور سورج وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو تم اس کے سوا کسی اور کے محتاج ہوئے اور وہ تمہارے لیے کافی نہ تھا کیونکہ اسی نے کھانے پینے کی چیزیں اور زمین و آسمان اور سورج وغیرہ چیزیں بنائی ہیں، وہی

تمہارے لیے کافی ہے اور یہ بھی خیال تک نہ کرو کہ جو بچہ ماں کا محتاج ہے، جو اس کو دودھ پلاتی ہے اور پرورش کرتی ہے، اللہ اس کا حسیب اور کافی ہے بلکہ اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے جس نے اس کی ماں کو پیدا کیا اور اس کے پستانوں میں دودھ بنایا اور بچے کو دودھ پینے کی ہدایت کی اور ماں کے دل میں شفقت اور محبت ڈالی یہاں تک کہ اس نے بچہ کو دودھ پینے دیا پس انہی اسباب سے کفایت حاصل ہوئی ہے اور اللہ اکیلا بچہ کے لیے ماں کو پیدا کرنے والا ہے، اگر تم سے کہا جائے کہ اکیلی ماں بچہ کے لیے کافی ہے، تو تم فوراً ہاں میں ہاں ملاؤ گے، اتنا کہنے کی توفیق نہ ہوگی کہ ماں اس کے لیے کافی نہیں ہے، کیونکہ وہ دودھ کا محتاج تو ہے مگر دودھ بھی تو ماں ہی سے پیدا ہوتا ہے، پس وہ ماں کے سوا اور کسی کا محتاج نہ ہوا مگر تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ دودھ ماں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ کیا ماں اور کیا دودھ دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے ہیں، پس وہ اکیلا ہر شخص کے لیے کافی ہے، اور اس کے سوا اور کوئی ایسی شے نہیں ہے جو تنہا کسی چیز کے لیے کافی ہو، بلکہ اشیاء ایک دوسرے سے متعلق ہوتی ہیں، اور سب کی سب خدا کی قدرت سے تعلق رکھتی ہیں۔

بندہ کو اس وصف میں کوئی دخل نہیں ہے، مگر بطریق مجاز بعید اور بلحاظ سرسری نظر اور ظن عام کے مجاز ہونا اس لحاظ سے ہے، کہ گو وہ اپنے بچہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ہے لیکن وہ فی الحقیقت کافی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی فی الحقیقت کافی ہوسکتا ہے، کیوں کہ بنفسہٖ تو خود اس کا اپنا وجود بھی قائم نہیں ہے اور نہ بنفسہٖ اپنے آپ کے لیے کافی ہے، تو غیر کے لیے کب کافی ہوسکتا ہے، بندہ کا کافی ہونا خلق عام کے لحاظ سے اس لیے ہے، کہ اگر فرض کیا جائے کہ وہ مستقل بالکفایت ہے، تو بھی وہ اکیلا کافی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ایسی محل کا محتاج ہے، جو اس کے فعل اور کفایت کو قبول کرسکتا ہے، کم از کم ایک کا محتاج ہوگا، جو محل علم ہے، تا کہ وہ تعلیم میں کافی بن سکے اور ایک معدہ چاہئے جو کھانا پہنچنے کی جگہ ہوتا ہے، تا کہ وہ بدن میں کھانا پہنچانے کے لیے کافی ہوسکے، علاوہ ان کے وہ اور بہت سی اشیاء کا محتاج ہوگا، جن کا کوئی شمار نہیں ہے اور ان میں سے کوئی شے بھی اس کے اختیار میں نہیں ہے اور خدا کا کافی ہونا اس لیے صحیح ہے کہ وہ خالق فعل ہے اور خالق محل ہے اور شرائط قبول کا خالق ہے، بندہ کا کافی کہلانا سرسری نظر سے اس لیے ہے کہ بسا اوقات ایک فاعل پر نظر پڑتی ہے، اور اس کے سوا اور کسی کا خیال بھی دل میں نہیں گزرتا، پس وہ دیکھتا ہے، یہ فاعل ہی کافی ہے حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، ہاں بندہ کا حصہ جو اس اسم سے ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ہمت اور ارادہ میں خاص اللہ تعالیٰ ہی اس کے لیے کافی ہو، یعنی اللہ کے سوا کسی کا ارادہ نہ کرے نہ جنت کی خواہش رکھے نہ اس کا دل دوزخ سے بچنے کی تدبیر کرنے میں مصروف رہے، بلکہ خاص خدا کے خیال میں ڈوبا رہے، اور جب اس کے جلال کا پرتو اس پر پڑے تو کہے بس یہی مجھے کافی ہے اس کے سوا مجھے اور کچھ درکار نہیں باقی اشیاء خواہ ہاتھ سے جائیں یا رہیں۔

اَلْجَلِیْلُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(بزرگ قدر) جلیل کے معنی جلال کی صفتوں سے موصوف اور جلال کی سنتیں ہیں۔غنی، ملک، تقدس، علم، قدرت وغیرہ جو اولاً مذکور ہوئیں، پس ان سب صفات کا جامع جلیل مطلق ہے، اور جو ان میں سے بعض کے ساتھ موصوف ہو، اس کی جلالیت اسی قدر ہے، جتنی صفتوں سے وہ موصوف ہو، جلیل مطلق صرف خدا تعالیٰ ہے، گویا کبیر کا مطلب کمال ذات ہے، اور جلیل کا کمال صفات ہے، اور صفات سب کی سب ادراک بصیرت کی طرف منسوب ہیں، بایں ہیئت کہ وہ بصیرت پر حاوی ہوجاتی ہیں، اور بصیرت ان پر حاوی نہیں ہوتی صفات جلال جب اس بصیرت کی طرف منسوب کی جائیں جو اس کو ادراک کرتی ہے، تو ان کو جمال کہتے ہیں اور ان سے متصف ہونے والا جمیل کہلاتا ہے، اسم جمیل اصل میں صورت ظاہری کے لیے موضوع ہے جو نظر سے محسوس ہوتی ہے جب کہ وہ اس طرز کی ہو کہ نگاہ پسند کرے پھر وہ صورت باطنی کے لیے منقول کیا گیا جو بصیرت یعنی عقلی نگاہ سے ادراک کی جاتی ہے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے فلاں شخص اخلاق جمیلہ رکھتا ہے اس میں خلق جمیل ہے، اور یہ صورت نظر عقلی سے ادراک کی جاتی ہے نہ کہ ظاہری نظر سے، غرض کہ باطنی صورت جب کامل متناسب اور ان تمام کمالات کی جامع ہو جو اس کے لائق ہوں اور جیسی چاہییں تو صورت بصیرت باطنہ کے لئے جو ادراک کرتی ہے پسندیدہ اور دلکش ہے، جس کے نظارے سے ایک ایسی لذت لطف اور سرور حاصل ہوتا ہے، جو بصارت ظاہری کے ذریعہ سے ظاہری جسیم و ملیح شکلوں کا نظارہ کرنے والوں کو حاصل نہیں ہوتا، جمیل مطلق خاص خدا تعالیٰ ہے کیونکہ دنیا

میں جو جمال وکمال اورحسن ودلربائی ہے، وہ اسی کی ذات کے انوار وصفات کے آثار سے ہے اور ایسا موجود اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے جس کو کمال مطلق حاصل ہو اور اس کا کوئی ثانی وجوداً یا مکاناً نہ ہو، اسی لیے اس کا عارف اور اس کے جمال کا مشاہدہ کرنے والا اس قسم کی لذت اور سرور محسوس کرتا ہے جس کے آگے جنت کی نعمتیں اور ظاہری صورتوں کی خوشنمائیاں ہیچ ہیں، بلکہ صورت ظاہری کے جمال کو معانی باطنہ کے جمال سے جو کہ بصیرت کے ذریعہ سے ادراک میں آسکتا ہے، کوئی مناسب نہیں ہے پس ثابت ہوا کہ وہ جلیل اور جمیل ہے، اور ہر جمیل دیدار کرنے والے کے لئے محبوب ومعشوق ہوتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے، کہ وہ محبوب ہو مگر ان لوگوں کے نزدیک جو اس کی معرفت سے بہرہ رکھتے ہیں جیسے ظاہری دل پسند صورتیں محبوب ہوتی ہیں مگر ان لوگوں کے نزدیک جو آنکھیں رکھتے ہیں نہ کہ اندھوں کے نزدیک۔ بندوں میں سے جلیل اور جمیل وہ ہے جس کی باطنی صفات اچھی ہوں جن سے ارباب بصیرت کے دل لذت پائیں، رہا جمال ظاہری سو وہ ایک کم قدر چیز ہے۔

اَلْکَرِیْمُ جل جلالہ:

(بزرگ) کریم وہ ہے کہ جب قدرت پائے تو معاف کرے اور جب وعدہ کرے تو اس کو پورا کر دکھائے اور جب دینے لگے تو توقع سے بڑھ کر دے یہ نہ دیکھے کہ کس کو دیتا ہے، اور کتنا دیتا ہے جب اس کو چھوڑ کر کسی اور کے سامنے حاجت پیش کی جائے تو اس کو منظور نہ کرے جو شخص اس سے التجا کرے اس کو یونہی نہ ٹالے

بلکہ اس کو وسیلوں اور سفارشوں کا بھی محتاج نہ رکھے پس جس میں یہ تمام صفات سچ مچ جمع ہوں بناوٹی نہ ہوں وہ کریم ہے، اور وہ صرف خداوند تعالیٰ ہے، ان صفات سے مزین ہونے کا فخر کبھی کبھی بندہ بھی حاصل کرتا ہے لیکن صرف بعض امور میں اور ایک قسم کی تکلیف سے حاصل کرتا ہے اسی لیے کبھی کبھی وہ کریم کی صفت سے موصوف کیا جاتا ہے لیکن کریم مطلق کی نسبت سے وہ ناقص ہے اور بندہ اس صفت سے کیوں نہ موصوف ہو جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انگور کے پھل کو کریم نہ کہو کیونکہ کریم بندہ مسلمان ہوتا ہے۔

اَلرَّقِیْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(نگہبان)، رقیب کے معنی علیم وحفیظ یعنی ہر شے کی حالت سے بخوبی واقف اور اس کا نگہبان، پس جو ذات کسی شے کی ایسی نگہبان ہو کہ اس سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو اور اس پر لازمی طور سے ہمیشہ نظر رکھے اس کو رقیب کہتے ہیں، گویا اس صفت کے مفہوم میں علم ارو حفظ داخل ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ وہ لازم اور دائم ہیں اور اس شے سے نسبت رکھتے ہیں جس سے خدا آفات کو دفع کرتا ہے، بندہ کے لئے مراقبہ کا وصف اس وقت محمود ہے جب کہ وہ خدا کے لئے اور اپنے دل کے لیے ہو، اور یہ اس طرح ہے کہ مراقبہ کرنے والا یقین رکھے کہ خدا ہر امر میں اس کا رقیب اور شاہد ہے، اور یقین رکھے کہ نفس بھی میرا دشمن ہے، اور شیطان بھی، اور یہ دونوں موقع کے انتظار میں ہیں کہ اس کو غفلت اور دین کی مخالفت پر آمادہ کریں لہٰذا وہ ان سے بچنے کی تدبیر کرے کہ ان کی گھاتوں، مکروں اور فریب کرنے کے موقعوں کو تاڑتا رہے، حتیٰ کہ ان کے تمام راستے اور سوراخ بند کر دے یہ مراقبہ ہے۔

اَلْمُجِیْبُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(دعا قبول کرنے والا) مجیب وہ ہے جو سائل کے سے سوال کو پورا کرے، دعا کو قبول فرمائے، لاچار لوگوں کی ضرورتیں مہیا کرے بلکہ التجا سے پہلے انعام دے اور دعا سے پیشتر بخشش کرے اور وہ صرف خداوند تعالیٰ ہے، کیونکہ وہی حاجت مندوں کی حاجتوں کو ان کے سوال سے پہلے جانتا ہے بلکہ ازل ہی سے اس کو ان کا علم ہے، مخلوقات کی حاجت روائی کے لئے کھانے اور غذائیں بنائی ہیں اور تمام کے لئے اسباب وآلات میسر کر دیئے، بندہ کو چاہئے کہ سب سے پہلے خدا کے امر ونہی کے لئے مجیب بنے پھر بندوں کے لیے مجیب بنے یعنی خدا نے جو نعمتیں اس کو عطا کی ہیں، ان میں سے سائلوں کے سوال پورے کرے، حتیٰ المقدور پھر سائلوں کی مدد وامداد کرے یا اگر کچھ بھی مقدور نہ ہو تو نرمی سے جواب دے۔

اَلْوَاسِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(وسیع المعلومات یا وسیع الغنی)، واسع وسعت سے مشتق ہے اور وسعت کبھی علم میں ملحوظ ہوتی ہے جب کہ علم وسیع ہو اور صاحب علم معلومات کثیرہ پر حاوی ہو اور کبھی احسان اور عطائے نعمت سے منسوب کی جاتی ہے خواہ کوئی لحاظ کرو اور کسی تقدیر کو لو، بہر حال واسع مطلق خدا تعالیٰ ہے، کیونکہ اگر اس کے علم کو دیکھو تو اس کی معلومات کے سمندر کا کوئی کنارہ ہی نہیں بلکہ اس کے کلمات لکھنے کے لئے سمندروں کو سیاہی کی جگہ استعمال کیا جائے تو سمندر ختم ہو جاویں گے، اگر اس کے احسان اور نعمت کو دیکھا جائے تو اس کی مقدورات کی کوئی انتہا نہیں، ہر وسعت کو کیسی ہی بڑی ہو وہ ایک نہ ایک طرف ضرور اختتام کو پہنچے گی، اور جو ذات کسی طرف بھی اختتام پذیر نہیں ہے، وہ وسعت کے اسم کی زیادہ حقدار ہے، لہٰذا خدا تعالیٰ ہی واسع مطلق ہے، کیونکہ ہر واسع اپنے سے زیادہ واسع کے مقابلہ میں غیر واسع یعنی تنگ ہے اور جو وسعت کسی نہ کسی طرف پر منتہی ہو جائے ممکن ہے کوئی اور وسعت اس سے بھی زیادہ بڑی ہو لیکن جس ذات کی نہ کوئی نہایت ہو اور نہ کوئی طرف ہو اس سے زیادہ وسعت تصور ہی میں نہیں آسکتی، بندے کی وسعت علوم اور اخلاق میں ہوتی ہے، پس اگر اس کے علوم بکثرت ہوئے تو اپنے وسعت علم کے موافق وہ واسع ہے اور اگر اس کے اخلاق وسیع ہو گئے حتیٰ کہ نہ محتاجی کا خوف اسے تنگ کر سکے اور نہ حاسد کا غصہ اور نہ حرص کا غلبہ تو وہ بھی واسع ہے، مگر یہ سب وسعتیں کسی نہ کسی حد پر ختم ہو جاتی ہیں حقیقی واسع صرف خدا ہی ہے۔

اَلْحَکِیْمُ جل جلالہ:

(حقائق اشیاء کا عالم) حکیم ک معنی صاحب حکمت اور حکمت سے مراد ہے افضل چیز کو افضل علم سے جاننا اور تمام اشیاء سے بزرگ خدا ہے اور یہ بیان ہو چکا ہے کہ حقیقی حکیم وہی ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی شے کو افضل علم کے ساتھ جانتا ہے، یعنی سب سے بڑی ذات اسی کی ہے اور افضل علم وہی ہے جو ازلی و دائم ہو اس کا زوال متصور نہ ہو، واقع کے ایسا مطابق ہو کہ اس میں کسی قسم کے خفا اور شبہ کا دخل نہ ہو، ایسے علم کے ساتھ خداوند تعالیٰ متصف ہے، کبھی اس شخص کو بھی حکیم کہہ دیا کرتے ہیں، جو عجیب عجیب صنعتی اشیاء بنائے اور ان کی بناوٹ میں خوبیاں اور استحکام پیدا کرے اس صنعت کا کمال بھی خاص خدا ہی کے لئے ہے، لہٰذا وہ حکیم مطلق ہے۔

جو شخص تمام اشیاء کو جانتا ہو مگر خدا کو نہ جانتا ہو وہ حکیم کہلانے کا مستحق نہیں کیونکہ وہ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ افضل شئے کو نہیں جانتا اور حکم کے تمام علوم سے زیادہ افضل علم ہے، اور علم کی بزرگی اس چیز کی بزرگی پر موقوف ہے جس کی نسبت علم ہو، اور خدا سے بڑھ کر کوئی شے بزرگ نہیں ہے لہٰذا جو شخص خدا کو پہنچانتا ہے، وہ حکیم ہے، گو باقی تمام علوم مروجہ سے بے بہرہ ہو اور ان کے متعلق کچھ بیان کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، یاد رکھو خدا کی حکمت اور بندے کی حکمت میں فرق ہے جو خدا کی نسبت بندے کے علم اور خدا کے علم میں فرق ہے، خیال کرو ان دونوں علموں میں کس قدر فرق ہے اور اس سے مجھ سکتے ہو اور ان دونوں حکمتوں میں کس قدر فرق ہے، تاہم یہ علم تمام علوم سے زیادہ نفیس اور زیادہ موجب خیر ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اس کو خیر کثیر دی گئی جو شخص خدا کو پہچان لیتا ہے، تو اس کا طرز کلام دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے، وہ جزئیات اور گھٹیا باتوں میں بہت کم غور و خوض کرتا ہے، بلکہ اس کا ہر کلام مجمل اور کلی اور معنی خیز ہوتا ہے، وہ دنیوی فوائد کا کم خیال کرتا ہے جو کچھ کہتا ہے عاقب میں فائدہ دینے والی بات کہتا ہے اور چونکہ اس کی یہ حالت لوگوں کے نزدیک اس کی معرفت الٰہی کی نسبت زیادہ ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا لوگ اس کے کلمات کلیہ کو اکثر حکمت کہا کرتے ہیں، اور ان کے قائل کو حکیم کا خطاب دیتے ہیں اس کی مثال محمد رسول اللہ ﷺ کے کلمات طیبات ہیں، (جو اپنے خدا کے حکم سے دنیا کے سامنے پیش کیے اور وہ خدا کا کلام قرآن ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے دنیا نے سنا اور پھر اس قرآن کی تفسیر ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے خود کر کے لوگوں کو سنائی جس کو عربی زبان میں حدیث نبوی ﷺ کہتے ہیں اور اس کتاب کے لکھنے سے ہماری غرض یہی ہے کہ تمام دنیا کو دکھائیں کہ ایک امی اور ناخواندہ اور بے سروسامان اریتیم اور بے کس اور بے یارومددگار یعنی محمد رسول اللہ ﷺ نے جو قرآن پیش کیا ہے اور تمام دنیا کے اولین و آخرین کو مات کر دیا ہے اور ازل سے ابد تک تمام کمالات علمی اور عملی کو اس قرآن میں بیان کر دیا ہے، اور کوئی علم اور کوئی حکمت اس قرآن سے باہر نہیں، اور اس قرآن میں جگہ بجگہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی کمال مجھ سے باہر نہیں اور ہر کمال کو تفصیلاً بیان کیا ہے، جیسا کہ بعد اس مقدمہ کے ہم کتاب کا بیان کرتے ہوئے دنیا کے ہر علم اور حکمت اور کمال کا ذکر کریں گے اور تمام دنیا کے علماء حکما اور عقلا وغیرہ سب پر روشن کر دیں گے، کہ یہ قرآن جو محمد رسول اللہ ﷺ پر خدا نے اتارا ہے اس میں سب کمالات ہیں اور موجودہ دنیا سب اسی کو دریوزہ گر ہے، اور ہر عقل مند پر روشن ہو جائے گا کہ سوائے اتباع قرآن کے چارہ نہیں، اور جو قرآن کے خلاف چلتے ہیں وہ بظاہر یہ دعویٰ زبان سے کرتے ہیں، ورنہ دنیا و آخرت کی خوبی اور ہر کمال جس جگہ موجود ہے، وہ قرآن ہی کا ہے، مثلاً اگر دنیا کے کسی انسان کو کوئی ترقی یا مرتبہ یا کوئی کمال جو حاصل ہے، تو وہ یا تو کسی کتاب کا ماننے والا ہے یا وہ بالکل مذہب سے کورا ہے، اگر وہ مذہب سے منکر ہے تب بھی اور اگر کوئی مذہب رکھتا ہے، تب بھی وہ قرآن کا گداگر ہے، کیونکہ مذہبی کتابوں میں کمالات نہیں اور نہ ہی دنیا کے فلاسفروں اور سائنس دانوں میں کمالات ہیں ان میں جو کچھ ہے وہ تو قطرہ و دریا، ذرہ و آفتاب ہے بلکہ سب کمالات قرآن نے دنیا کو سکھائے۔ ان شاء اللہ العزیز ہم بعد تحریر مقدمہ قرآنی کمالات ذکر کریں گے، ناظرین انتظار کریں، یہاں صرف چند کمالات بطور نمونہ پیش کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ بطور نصیحت فرماتے ہیں، لیکن یاد رہے یہ قرآن شریف نہیں، بلکہ یہ اس قرآن ہی کی چند آیتوں کی تفسیر ہیں جو زبان محمد ﷺ نے فرمائے ہیں، کیونکہ محمد ﷺ اپنی خواشہ سے نہیں بولتا بلکہ اس کی زبان مبارک سے خدا کا کلام جاری ہوتا ہے، یعنی قرآن اور قرآن کی تفسیر یعنی حدیث جیسا کہ وہ فرماتا ہے وماینطق عن الھوان ھوالاوحی یوحی: یعنی وہ محمد ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی خدا ہے جو اسی کی زبان فیض ترجمان سے جاری ہوتا ہے، الغرض محمد ﷺ کی زبان درخشاں سے خدا کا کلام یا اس کلام کی تفسیر جاری اور بیان ہوتے ہیں۔

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است

الحاصل کمالات محمدی ﷺ کتاب میں چل کر بیان ہوں گے، جیسا کہ اشتہار میں مشتہر ہے یہاں قدرے بطور نمونہ بیان کرتے ہیں، محمد رسول ﷺ کے اس کلام کا جو قرآن کی تفسیر یعنی حدیث محمد ﷺ ہے فرماتے ہیں)، سب سے بڑی حکمت خدا کا خوف ہے (۲) دانا وہ ہے جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور آخرت کے لئے نیک کام کئے، اور عاجز وہ ہے، جو اپنے نفس کے تابع ہوا، اور خدا سے بے ہودہ التجائیں کرتا رہا (۳) تھوڑی اور کافی چیز اس سے اچھی ہے، جو زیادہ ہو اور بے ہودگی میں ڈالے (۴) جو شخص تندرست رہے، اور اپنے گھر میں امن سے بسے اس کے پاس دن بھر کی خوراک ہو گویا دنیا ساری کی ساری اس کے کام آ رہی ہے (۵) پرہیزگار ہو تا کہ سب سے بڑے عابد قرار پاؤ، قناعت کرو تا کہ سب سے زیادہ شاکر بنو (۶) مصیبت زبان کھولنے پر منحصر ہے (۷) بندے کی اچھی مسلمانی ہے، کہ جو امر اس کا ممد نہ ہو اس کو چھوڑ دے (۸) نیک انسان وہ ہے جو دوسرے سے عبرت حاصل کرے (۹) خاموشی حکمت ہے جس پر چلنے والے کم ہیں (۱۰) قناعت وہ مال ہے جو کم نہیں ہوتا (۱۱) صبر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے، غرض قسم قسم کے کلمات کو حکمت اور ان کے قائل کو حکیم کہتے ہیں۔

اَلْوَدُوْدُ جل جلالہ:

(نیک بندوں کو دوست رکھنے والا)، ودود وہ ہے جو تمام مخلوقات کے لئے بہتری چاہتا ہو لہٰذا ان کے ساتھ بھلا کرے، اور ان کی تعریف بھی کر دیا کرے یہ اسم رحیم کے معنی کے قریب قریب ہے لیکن رحمت کی نسبت مرحوم کی طرف ہوتی ہے اور مرحوم وہ ہوتا ہے، جو محتاج اور لاچار ہو، رحیم کے افعال تو مرحوم کی ضعیف چاہتے ہیں، ودود کے افعال نہیں چاہتے بلکہ دوستی کا نتیجہ یہ ہے، کہ بلا تحریک آپ سے آپ نعمت بخشی جائے پس جس طرح خدا کی رحمت کے معنی یہ ہیں، کہ وہ مرحوم کے لئے بھلائی اور حاجت روائی کا ارادہ کرتا ہے، اور رحم کے باعث درد دل کے عارض ہونے سے وہ منزہ ہے، اسی طرح اس کی مودت یعنی دوستی یہ ہے کہ وہ بخشش نعمت احسان اور انعام کا ارادہ کرتا ہے، اور وہ دوستی کے بے اختیار سیلان سے مبرا ہے، اس کی رحمت اور مودت جو مرحوم اور مودود کے حق میں صادر ہوتی ہے تو رقت یا دوستی کے میلان کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس کے ثمرہ اور فائدہ کے لئے ہوتی ہے پس فائدہ ہی رقت وجودت کا نچوڑ ہے، اور یہ خاص خدا کا حق ہے، مرحوم و مودود کا نہیں، خدا فائدہ رسانی کا ذمہ دار نہیں ہے۔

خدا کے بندوں میں ودود وہ ہے جو مخلوق کے لئے وہی چاہے، جو اپنے لیے چاہتا ہے اور اس سے بھی اعلیٰ وہ شخص ہے جو ان کو اپنے پر مقدم سمجھے، چونچہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ کاش میں دوزخ کا پل بن جاتا تا کہ لوگ مجھ پر سے صحیح وسلامت گذر جاتے، اس صفت کا کمال یہ ہے کہ غصہ کینہ اور جو تکلیف پہنچی ہو وہ اس ایثار واحسان کی مانع نہ ہو (جیسے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی تمام عمر میں دنیا کے انسانوں سے غیر معمولی اور ناقابل برداشت رنج اور دکھ اٹھائے مگر اپنی جان مال، زندگی موت عزت سب کچھ خدا کے احکام پر قربان کر دیئے اور خلق خدا کے رنج برداشت کر کے ان کے حق میں بہتری کی دعا اور ان کے لئے عمدہ تعلیم اور ان کے لئے عمدہ زندگی کی تعلیم اور ان سے عمدہ سلوک اور ہمدردی اور احسان کرتے ہیں، کوشش اور سعی کی اور اپنی تمام عمر صرف مخلوق ہی کی بہتری کے لئے صرف کی آپ نے اپنا تقدس پیش کیا اور آپ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور آپ نے دنیا کے گذشتہ اور موجودہ اور آئندہ تمام انسانوں کے سر پر وہ احسان کئے جو کتاب میں چل کر تحریر ہوں گے، یہاں صرف ایک واقعہ بیان کر دیا جاتا ہے)، اور وہ یہ ہے کہ ایک جنگ میں رسول اللہ محمد ﷺ کی ذات پاک کو ایک بدظن کافر نے ایک پتھر اٹھا کر مارا اور آپ ﷺ کا اگلا دانت شہید ہو گیا، اور سخت چوٹ لگی اور چہرہ انور خون آلودہ ہو گیا مگر آپ نے فرمایا کہ اے میرے خدا! میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ کچھ جانتے نہیں پس ان لوگوں کی بدسلوکی آپ کو اس ارادہ سے باز نہ رکھ سکی جو آپ ان کی فائدہ رسانی کے متعلق رکھتے تھے اور جیسے کہ آپ یعنی محمد ﷺ نے حضرت علی اپنے دوست کو ارشاد فرمایا تھا، کہ اگر تم چاہو کہ مقربین سے بھی سبقت لے جاؤ تو بدسلوکی کرنے والے سے نیک سلوک کرو نہ دینے والے کو دو، ظلم کرنے والے کو معاف کرو۔

اَلْمَجِیْدُ جل جلالہ:

(شریف، بزرگ) مجید وہ ہے جس کی ذات شریف جس کے افعال پسندیدہ اور جس کی عطا گراں قدر ہو غرض جس کے شرف ذات کے ساتھ حسن افعال شامل ہو اس کو مجید کہتے ہیں، اور ماجد بھی اسی کو کہتے ہیں، مگر مقدم الذکر اسم مبالغہ پر دلالت کرتا ہے اور گویا وہ الخلیل اور الوہاب اور الکریم کے معنوں کا جامع ہے، ان دونوں کے متعلق پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

اَلْبَاعِثُ جل جلالہ:

(مردوں کو مرنے کے بعد اٹھا کر کھڑا کر دینے والا) باعث وہ ہے جو قیامت کے دن خلقت کو زندہ کرے گا اور اہل قبور کو کھڑا کرے گا، بعث آخرت میں اٹھائے جانے کو کہتے ہیں اور اس اسم کو سمجھنا بعث کی حقیقت سمجھنے پر موقوف ہے، اور یہ علمی باتوں میں سب سے زیادہ باریک بات ہے، اکثر لوگ اس کے متعلق مجمل توہمات اور مبہم تخیلات میں مبتلا ہیں، بڑا شک ان کا یہ ہے کہ موت ایک عدم اور بعثت از سر تو ایجاد ہے جو عدم کے بعد ہوتی ہے او یہ ایجاد ویسے ہی ہے جیسے پہلی ایجاد تھی، مگر ان کا یہ خیال کہ موت عدم ہے غلط ہے اسی طرح یہ خیال بھی غلط ہے کہ دوسری ایجاد پہلی ایجاد جیسی ہے موت عدم محض نہیں ہے بلکہ موتی کی قبر یا تو آگ کا گڑھا ہوتی ہے یا گلستانِ جنت کا ایک چمن ہوتی ہے اور مردے یا تو خوش قسمت اور نجات یافتہ ہوتے ہیں یا بدنصیب اور زیر عذاب ہوتے ہیں، پہلا گروہ یعنی جو مردے خوش قسمت ہوتے ہیں، وہ مرنے والے نہیں ہوتے، خدا قرآن میں فرماتا ہے ولا تقولو لمن یقتل فی سبیل اللہ اموت بل احیاء ولکن لا تشعرون: یعنی جو خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردے نہ کہو وہ زندے ہیں لیکن تم کو شعور نہیں، اور دوسری جگہ خدا فرماتا ہے۔ ولا تحسبن الذین قتلو فی سبیل اللہ اموات بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما اتاھم اللہ من فضلہ: یعنی جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مردے نہ خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق اور عزت پاتے ہیں، خدا نے جو اپنا فضل ان پر کیا ہے، اس سے خوش ہیں، اور دوسرا گروہ یعنی مردے بدنصیب جن کی قبریں دوزخ کے گڑھے ہوتے ہیں اور ان کو عذاب ہوتا ہے یعنی خدا کے نافرمان بندے گنہگار وہ بھی زندے ہوتے ہیں اسی لیے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر میں کافروں کو پکار کر فرمایا تھا، خدا نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا میں نے اس کو درست پایا، تم سے جو وعدہ خدا نے کیا تھا تم نے بھی اس کو درست پایا، آپ کی خدمت اقدس میں عرض کیا گیا، کہ آپ ان لوگوں کو کیونکر پکار رہے ہیں جو مر چکے ہیں، فرمایا تم میری بات کو ان کی نسبت کچھ زیادہ سننے والے نہیں ہو، یہ بھی سنتے ہیں مگر جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتے۔ باطنی مشاہدہ ارباب بصائر کو بتلا رہا ہے کہ انسان کو ہمیشہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے عدم اس پر طاری نہیں ہو سکتا، ہاں ایک بار اس کا تصرف جسم سے بند ہو جاتا ہے تو دیکھنے والے کہتے ہیں، مر گیا جب وہی تصرف پھر جاری ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ زندہ ہو گیا (اور اس مسئلہ کو عنقریب ہم با دلائل پوری تفصیل سے بیان کریں گے، جن کو خیال ہے کہ انسان مر جاتا ہے، وہ محض ان کا خیال غلط ہے عنقریب ان کا رد دکھایا جاوے گا) ان لوگوں کا یہ خیال بھی بالکل بے سرو پا ہے کہ مردے کو زندہ کرنا دوسری ایجاد ہے جو پہلی ایجاد جیسی ہے، بلکہ مردے کا زندہ ہونا ایک دوسری پیدائش ہے جو پہلی پیدائش سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی، انسان کی صرف دو پیدائشیں نہیں ہیں بلکہ بہت سی پیدائشیں ہیں، اسی لیے خدا نے فرمایا ہے: ننشئکم فی مالا تعلمون یعنی ہم تم کو ایسی ایسی حالتوں میں پیدا کرتے ہیں اور کریں گے کہ تمہیں بالکل معلوم نہیں اور اسی طرح خدا نے انسانی پیدائش میں خون بستہ اور مضغہ وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا ہے: ثم انشانہ خلقا اخر: یعنی پھر ہم نے اس کو دوسری پیدائش میں پیدا کیا بلکہ نطفہ خاک کی ایک پیدائش ہے اور جمع ہوا خون نطفہ کی ایک پیدائش ہے اور روح کی پیدائش کے شرف وجلالت اور اس کے ایک امر ربانی ہونے کی وجہ سے اس مقام پر خدا نے فرمایا: ثم انشانہ خلقا اخر فتبارك اللہ احسن الخالقین: پھر آخر کار ہم نے ہی گویا بالکل دوسری ہی مخلوق کی صورت میں بنا کھڑا کیا تو پاکی ہے خدا کو، خدا بڑا ہی بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر بنانے والا ہے اور نیز خدا نے قرآن میں فرمایا ہے۔ یسئلونك عن الوح قل الروح من امر ربی: یعنی تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہو روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے پھر اصل روح پیدا کرنے کے بعد ادراکات حسیہ کا پیدا کرنا ایک علیحدہ پیدائش ہے

پھر تمیز کا پیدا ہونا جو ساتویں سال کی عمر میں ظاہر ہوتا ہے، ایک پیدائش ہے پھر پندرہ سال کی یا اس سے کم وبیش کی عمر میں عقل کا پیدا ہونا ایک اور پیدائش ہے یہ ہر

پیدائش ایک طور ہے وقد خلقکم اطوارا: (یعنی خدا قرآن میں فرماتا ہے کہ اے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام انسانوں کو فرما دیجئے کہ میرا خدا یوں فرماتا ہے کہ اے لوگو): خدا نے تم کو کئی طرز وطور میں بنایا ہے پھر کسی شخص میں ولایت کی خاصیت کا ظاہر ہونا بھی ایک جدا پیدائش ہے اس کے بعد نبوت کی خاصیت کا ظاہر ہونا ایک اور ہی جداگانہ پیدائش ہے، اور وہ ایک طرح کا بعث ہے، اللہ تعالیٰ باعث الرسل ہے جیسے کہ باعث یوم النشور بھی ہے۔ اور جس طرح شیر خوار بچہ کو تمیز حاصل کرنے سے پیشتر اس کی حقیقت اور اس کے عجائبات کا جاننا دشوار ہے، اسی طرح عقل کی منزل میں ولایت اور نبوت کا سمجھنا مشکل ہے کیونکہ ولایت پیدائش عقل کے اوپر ایک خاص طور کا کمال ہے، جس طرح عقل پیدائش تمیز سے اوپر ایک طور کا کمال ہے تمیز پیدائش حواس سے اوپر ہے ایک علیحدہ طور کا کمال ہے، چونکہ لوگوں کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ جو مرتبہ ان کو خود حاصل نہ ہوجائے وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ ہر شخص کسی امر کو ماننے یا سچ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، تاوقتیکہ اس کو دیکھ نہ لے اور خود حاصل نہ کرلے۔ کبھی چھپی اور غائب بات پر یقین نہیں کرتا۔ اس لئے لوگ طبعاً ولایت اور نبوت اور ان کے عجائبات بلکہ ان کی اصلیت سے منکر ہوتے ہیں، اور دوسری پیدائش اور آخرت کی زندگی کو نہیں مانتے، کیونکہ انہوں نے اب تک ان امور کو دیکھا اور برتا نہیں ہے اگر صرف تمیز کے درجہ تک پہنچنے والے کے سامنے عالم عقل اور اس کے عجائبات کا نقشہ پیش کریں تو وہ اس کو ماننے کے لئے کبھی تیار نہ ہوگا۔

پس جو شخص غیر حاصل شے پر ایمان لائے، وہ گویا غیب پر ایمان لایا اور یہی تمام سعادتوں کی کنجی ہے، جب طور عقل اور اس کے ادراکات اور اس کی پیدائش سابقہ ادراکات سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے تو آخرت کی پیدائش تو نہایت ہی بعید ہے لہٰذا دوسری پیدائش کو پہلی پیدائش پر قیاس نہ کرنا چاہیے، یہ تمام پیدائشیں ایک ہی ذات کے مختلف اطوار اور اس کے لئے مراتب کمال طے کرنے کے زینے ہیں، حتیٰ کہ وہ اس بارگاہ احدیت کا قرب حاصل کرتا ہے، جہاں تمام کمالات کی انتہا ہوجاتی ہے، اور وہ خدا کے نزدیک اور قبول اور حجاب و وصول میں متردد رہتا ہے، آخر مقبول ہوجائے تو اعلیٰ علیین پر ترقی کر جاتا ہے ورنہ اسفل السافلین میں گر جاتا ہے، مطلب یہ کہ ان دونوں پیدائشوں میں لفظی مناسبت کے سوا اور کوئی تعلق نہیں ہے اور جو شخص نشات یعنی پیدائش اور بعث کے معنی نہیں جانتا وہ اسم

الباعث کے معنی نہیں سمجھ سکتا اور ان کی شرح طویل ہے (آگے ذکر کریں گے) بعث کی حقیقت کا مطلب یہ ہے، مردوں کو دوسری پیدائش میں پیدا کر کے زندہ کرنا اور جہل سب سے بڑی موت ہے اور علم سب سے پاکیزہ زندگی ہے، (اور وجہ یہ ہے) کہ خدا نے قرآن میں اہل علم کو زندہ اور جاہلوں کو مردہ فرمایا ہے، جو شخص کسی دوسرے انسان کو جہل سے علم تک ترقی دیتا ہے، گویا وہ اس کو موت سے نئی پیدائش میں لاتا ہے اور ایک پاکیزہ زندگی بخشتا ہے پس اگر بندہ لوگوں کو علم پڑھائے اور سیدھی راہ دکھائے تو ان کو گویا ایک طرح سے زندہ کرتا ہے، اور یہ انبیاء اور ان کے وارث علماء کا کام ہے (اور اس کام کو محمد رسول اللہ ﷺ نے جیسا دنیا میں کر کے دکھایا ہے، ایسے کوئی نہیں دکھا سکا، یہی وجہ ہے آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ نے دنیا کے گمراہوں کو ایسا زندہ کیا اور وہ علوم کے دروازے کھول دیئے کہ تمام جاہلا ور ناداں لوگوں کو ہدایت اور زندگی روحانی حاصل ہوگئی۔ جس کو ہم کتاب کے ذکر میں آگے چل کر بیان کریں گے اور رسول کریم ﷺ کے کمالات لوگوں کو دکھائیں گے۔ ان شاء اللہ اس کتاب کو پڑھ کر تعلیم پا کر لوگ مردوں سے زندے ہوجائیں گے)۔

اَلشَّهِيدُ جل جلالہ:

(حاضر)، اس اسم کے معنی علیم کے معنوں سے ملتے ہیں، اور ساتھ ہی اضافت کی خصوصیت بھی ملحوظ ہے کیونکہ خدا عالم الغیب والشہادت ہے، یعنی غیب اور شہادت سے مراد وہ باتیں ہیں (جو بقدر استعداد اس کی مخلوق سے فرشتے یا انسان یا حیوان وغیرہ جانتے ہیں، ورنہ خدا کے نزدیک کوئی چیز غیب نہیں ہے یہ جو کہتے ہیں غیب کا علم یا غیب کی بات وہ صرف بندے اپنی نسبت کہتے ہیں، ورنہ خدا کے نزدیک سب کچھ ظاہر ہے وہاں کوئی شے غائب نہیں اور غائب کی بہت قسمیں ہوتی ہیں، عنقریب ان کی بحث کتاب میں کی جاوے گی، یہ مقدمہ اس طویل بحث ا متحمل نہیں) پس اگر مطلق علم کا لحاظ کیا جائے تو وہ علیم ہے اور اگر غیب اور چھپی باتوں سے نسبت دی جائے تو وہ خبیر ہے اور اگر امور ظاہرہ سے نسبت دی جائے تو وہ شہید ہے کبھی اس کے ساتھ یہ بھی لحاظ کیا جاتا ہے، کہ وہ قیامت کے دن لوگوں کے کاموں کے متعلق شہادت دے گا، جن کو وہ جانتا اور دیکھتا ہے، اس اسم کی بحث علیم اور خبیر کی بحث کے قریب قریب ہے، (اور وہ تحریر ہوچکی ہے وہاں دیکھنی چاہئے)۔

اَلْحَقُّ جل جلالہ:

(ثابت)، یہ باطل کے مقابلہ میں ہے اور تمام اشیاء اپنے اضداد کے مقابلہ میں ظاہر ہوتی ہیں جس چیز کی نسبت خبر دی جاتی ہے وہ یا تو مطلقاً باطل ہوگی یا مطلق حق ہوگی یا ایک وجہ سے حق اور ایک وجہ سے باطل ہوگی، پس بذاتہٖ ممتنع وہی ہے جو مطلقاً باطل ہو، اور واجب بذاتہٖ وہی ہے جو مطلقاً حق ہو اور ممکن بذاتہٖ مگر واجب بغیرہٖ وہ ہے جو ایک وجہ سے باطل اور ایک وجہ سے حق ہو، پس چونکہ اپنی ذات کی حیثیت سے اس کا وجود نہیں ہے، اس لیے وہ باطل ہے اور غیر کی حیثیت سے وجود کا استفادہ کرتا ہے، اس لیے وہ اس وجہ سے جو وجود کا افادہ کرنے والے سے متصل ہے، اسی لیے خدا قرآن میں فرماتا ہے: کل شی ھالك الا وجھه: اور وہ اسی طرح ازلاً وابداً ایک ہی حال پر قائم ودائم ہے، مختلف حالات قبول نہیں کرتا، کیونکہ اس کے سوا ہر شے ازل سے ابد تک من حیث الذات وجود کی مستحق نہیں ہے اور اپنے غیر کی جہت سے مستحق ہے لہٰذا وہ بذاتہٖ باطل ہے، اور بغیرہٖ حق ہے: اب صاف ظاہر ہے کہ حق مطلق وہ ہے، جو موجود حقیقی بذاتہٖ ہے اور جس سے ہر حق اپنی حقیقت اخذ کرتا ہے، حق کے ایک اور معنی بھی ہیں، یعنی وہ امر معقول جس کی عقل تصدیق کرے اور وہ موجود ذہنی ہے جس کی نسبت یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ وہ حق ہے، پس وہ اپنی ذاتی حیثیت سے امر موجود کہلاتا ہے، اور جب عقل سے اس کو نسبت دی جائے جس نے اس کی حالت معلوم کی ہے، تو اس کو حق کہتے ہیں، اس لحاظ سے بھی تمام موجودات میں سے حق کہلاتے کا زیادہ حقدار خداوند تعالیٰ ہی ہے اور معلومات میں سے حق کہلانے کی زیادہ حق دار خدا کی معرفت ہے کیونکہ وہ فی نفسہٖ حق ہے، یعنی ازلاً ابداً معلوم کے مطابق ہے اور اس کی مطابقت بذاتہٖ ہے بغیرہٖ نہیں ہے، اس کا علم ایسا نہیں ہے، جیسے اس کے غیر کے وجود کا علم کیونکہ غیر کے وجود کا علم اسی وقت تک رہتا ہے، جب تک کہ وہ غیر موجود رہتا ہے، جب وہ معدوم ہوگیا تو اس کے وجود کا اعتقاد بھی باطل ہوگیا، اقوال کو بھی حق کہہ دیتے ہیں، چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں قول حق ہے اور فلاں قول باطل ہے، اس لحاظ سے تمام اقوال سے زیادہ حق لا الہ الا اللہ ہے، کیونکہ وہ ازلاً اور ابداً بذاتہٖ صادق ہے، نہ کہ بغیرہٖ (اور اس کتاب میں صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا بیان مطلوب ہے کیونکہ وہ توحید اور رسالت پر مشتمل ہے، یعنی خدا معبود برحق ہے، اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کا سچا رسول اور نبی تمام عالم کا مطاع اور مخدوم ہے، ان شاء اللہ العزیز آگے توحید اور رسالت کا بیان

Farooqi
2.17

ہوگا)،غرض خارجی موجودات کوحق کہیں یا ذہنی موجودات کوجن کو معرفت کہتے ہیں،خواہ زبانی موجود کوحق کہیں جس کونطق کہتے ہیں،بہر حال حق کہلانے کی زیادہ حقدار وہی شے ہے جس کا وجود ازلاًوابداًبذاتہٖ حق ہواور یہ تمام امور موجود حقیقی کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی سے نہیں۔

اس اسم سے بندے کا حصہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو باطل سمجھے خدا کے سوا اور کسی کو حق نہ جانے بندہ اگر چہ حق ہے مگر بنفسہٖ حق نہیں ہے، بلکہ خدا کے ساتھ حق ہے، کیونکہ وہ اس کے ساتھ موجود ہے بذاتہٖ موجود نہیں ہے، بلکہ بذاتہٖ باطل ہے، اگر حق تعالیٰ نے اس کو نہ بنایا ہوتا تو اس کو خود بخود بن جانے کا کوئی حق نہ تھا، اس لحاظ سے ان دو تاویلوں کے سوا جو شخص اناالحق میں حق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ سخت خطاء پر ہے، پہلی تاویل یہ ہے کہ اناالحق سے مراد انا بالحق ہے، یعنی میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں یہ تاویل بعید ہے، اس لئے کہ لفظوں میں اس معنی کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، اور اس لئے یہ امر صرف اس قائل سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حق کے سوا جو شے ہے، وہ بالحق ہے۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ میں مستغرق ہے، حتیٰ کہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے گنجائش نہیں، اور جو چیز کسی چیز کی کلیت کو حاوی ہو اور اس میں مستغرق ہو تو کہا جاتا ہے، یہ چیز وہ ہے، جیسے کسی شاعر نے کہا ہے

انا من اھویٰ و من اھویٰ انا

یعنی میں وہ ہوں جس کی خواہش کرتا ہوں اور وہ جو خواہش کرتا ہے میں ہوں۔

(تو من شدی من توشدم، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد زیں، من دیگرم تو دیگری)
(خسرو)

اس سے مراد استغراق ہے، چونکہ اہل تصوف پر من حیث الذات اپنے نفس کی فنا کا مشاہدہ غالب ہوتا ہے، اس لئے ان کی زبان پر باغلب احوال اسمائے باری تعالیٰ میں سے ہوالحق جاری رہتا ہے، کیونکہ وہ حقیقی ذات کو ملحوظ رکھتے ہیں، نہ کہ اس ذات کو جو فی نفسہٖ ہلاک ہونے والی ہے اور اہل کلام چونکہ افعال کے ساتھ ذلیل پکڑنے کے عادی ہیں اس لئے ان کے منہ پر اکثر اسم البار ی جاری رہتا ہے، جس کے معنی خالق کے ہیں، اروا کثر لوگ خدا کے سوا ہر چیز کو دیکھتے ہیں پس انے مشاہدات سے اس کے متعلق شہادت قائم کرتے ہیں، اور وہ خدا کے اس قول سے مخاطب ہیں اولم یتفکروفی ملکوت السموت والارض وماخلق اللہ من شئی: یعنی کیا ان لوگوں نے زمین وآسمان اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے انتظام میں غور وفکر سے کام نہیں لیا صدیقین اس کے س وا کسی ارو چیز کو نہیں دیکھتے لہٰذا وہ اس کے متعلق اسی سے دلیل قائم کرتے ہیں، اور وہ خدا کے اس قول سے مخاطب ہیں کہ اولم یکف بربک انہ علیٰ کل شئی شہید: یعنی کیا تمہاری تسلی کو یہ بات کافی نہیں، کہ تمہارا پروردگار ہر چیز کا شاہد حال ہے۔

اَلْوَکِیْلُ جل جلالہ:

(کارساز)، وکیل وہ ہے، جس کے سپرد امور کئے جائیں، لیکن اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جس کے سپرد بعض امور کئے جائیں اور وہ ناقص ہے دوسرا وہ جس کے سپرد تمام امور ہوں اور وہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں، ایک اور طریق سے بھی اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جو بذاتہٖ موکول الیہ (جس کے سپرد کیا جائے) ہونے کا مستحق نہ ہو بلکہ موکول الیہ بنانے سے بنا ہو اور یہ ناقص ہے کیونکہ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ امور اس کے سپرد کئے جائیں اور اس کو مختار بنایا جائے دوم وہ جو بذاتہٖ اس بات کا مستحق ہے کہ امور اس کے سپرد ہوں کسی دوسرے کے اختیار دینے اور سپرد کرنے سے نہیں بلکہ وہ خود بخود اور بذاتہٖ وکیل ہو وہ وکیل مطلق ہے، جس کے سپرد تمام اشیا ہیں، اور وہ تمام کے اہتمام میں لگا ہوا ہے، اور سب کو اپنی اپنی جگہ پورا کر رہا ہے، اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے، ارواس سے تم خود سمجھ سکتے ہو، کہ بندہ کو اس اسم کے معنی میں کس قدر دخل حاصل ہے۔

اَلْقَوِیُّ، اَلْمَتِیْنُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

القویٰ (توانا)، المتین (استوار)، قوت پوری قدرت پر اور متانت سخت قوت پر دلالت کرتی ہے، پس اللہ تعالیٰ اس حیثیت سے کہ حاوی اور پوری قدرت والا ہے، قوی ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ سخت قوت والا ہے متین ہے، ار و یہ بیان قدرت کے معنی سمجھنے پر موقوف ہے، جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

الولی: (محب و مددگار)، ولی محب و مددگار رہے اس کی محبت اور دوستی کے معنی بیان ہو چکے، اس کی مددگاری کے معنی ظاہر ہیں، کہ وہ دین کے دشمنوں کو پامال کرتا ہے اور دین کے خیر خواہوں کی مدد کرتا ہے، جیسا کہ وہ خود قرآن میں فرماتا ہے اللہ ولی الذین امنو: یعنی خدا ایمان والوں کا محب و مددگار ہے، اور فرماتا ہے کذلك بان اللہ مولی الذین امنو و ان الکافرین لا مولی لھم: یعنی ایسا اس لئے ہے کہ خدا مومنوں کا مولا یعنی ناصر و مددگار ہے، ار و کافروں کا کوئی مولا نہیں، اور فرماتا ہے، کتب اللہ لا غلبن انا و رسلی! یعنی خدا نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غالب آئیں گے۔

بندوں سے ولی وہ ہے جو خدا اور اس کے دوستوں سے پیار کرے، اور ان کی مدد کرے اور خدا کے دشمنوں سے بغض رکھے خدا کے دشمن نفس اور شیطان ہیں پس جو شخص ان دونوں سے تعلق توڑ دے اور خدا کے کام میں مدد دے اور اس کے اولیا کو دوست رکھے اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھے وہی بندوں میں سے ولی ہے۔

اَلْحَمِیْدُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(مستحق حمد) حمید وہ ہے جو تعریف کے لائق ہو اور جس کی ثنا کی جائے خدا تعالیٰ ازل سے خود اپنی تعریف کے ساتھ حمید ہے، اور ابد تک اپنے بندوں کی تعریف کے ساتھ حمید رہے گا، اور یہ معنی جلال و کمال کی صفتوں سے ذکر کرنے والوں کے ذکر کے لحاظ سے پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ حمد اسی کو کہتے ہیں، کہ اوصاف کمال کا اس حیثیت سے کہ وہ کمال ہیں، ذکر کیا جائے۔

بندوں میں سے حمید وہ ہے جس کے عقائد واخلاق اور اعمال واقوال سب کے سب بلا شائبہ قابل تعریف ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان سے قریب کے انبیاء اور ان کے سوا اولیا اور علماء ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنے عقائد واخلاق اور اقوال کی خوبی کے موافق حمید ہے، چونکہ کوئی شخص گو اس کے محامد کتنے ہی بکثرت ہوں مذمت اور نقص سے خالی نہیں ہے، لہٰذا حمید مطلق خاص خدا تعالیٰ ہی ہے۔

اَلْمُحْصِی جل جلالہ:

(ہر چیز کو احاطہ علم میں کرنے والا) محصی کے معنی عالم کے ہیں لیکن جب علم کو معلومات کے ساتھ اس لحاظ سے منسوب کیا جائے کہ وہ معلومات کو محیط ہوتا ہے، اور ان کو گنتی اور شمار میں لاتا ہے تو اس کو احصا کہا جاتا ہے، اور محصی مطلق وہ ہے جس کے علم میں ہر معلوم کی حد اور اس کی تعداد مبلغ ظاہر ہو بندہ اگر چہ ایسے علم سے بعض معلومات کا احصار کر سکتا ہے، مگر وہ اکثر حصر سے عاجز آجاتا ہے پس اس اسم میں اس کا دخل اسی طرح کم ہے جس طرح علم کی اصل صفت میں کم ہے۔

اَلْمُبْدِئُ، اَلْمُعِیْدُ جل جلالہ:

المبدی: (ابتداء پیدا کرنے والا)۔**المعید:** (دوبارہ پیدا کرنے والا) ان اسموں کا معنیٰ ہے موجد لیکن اگر اس ایجاد سے پہلے ویسی ایجاد نہ گزر چکی ہو تو اس کو ایجاد کہتے ہیں اور اگر اس سے پہلے بھی ویسی ایجاد گزر چکی ہو تو اس کو ابدا کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی نے لوگوں کو ابتدا سے پیدا کیا ہے اور وہی ان کو دوبارہ پیدا کرے گا، اور تمام اشیاء کا اسی سے آغاز ہوا اور اسی تک انجام ہوگا۔

اَلْمُحْیِی، اَلْمُمِیْتُ جل جلالہ:

المحی: (مخلوق کو زندہ کرنے والا)۔**الممیت:** (مارنے والا)، ان دونوں اسموں کا مطلب بھی ایجاد ہے لیکن موجود اگر حیات ہو تو اس کے فعل کو احیا یعنی زندہ رکھنا کہتے ہیں، اور موت ہو تو اس کے فعل کو اماتت یعنی مار ڈالنا کہتے ہیں، اور موت وحیات کا خالق خدا تعالیٰ ہی ہے، اسی لیے سوائے اس کے اور کوئی **محیِ و ممیت** نہیں ہے، اسم الباعث کے بیان میں حیات کے معنی کی طرف اشارہ گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اَلْحَیُّ جل جلالہ:

(زندہ) حی وہ ہے جو فعل کی اعلیٰ طاقت رکھنے والا، اور اعلیٰ درجہ کا صاحب ادراک ہو حتیٰ کہ جس میں بالکل فعل وادراک نہیں ہے، وہ میت مردہ ہے، اور ادراک کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صاحب ادراک اپنے آپ کو جانتا ہو، پس جو شے اپنے آپ کو نہ جانتی ہو وہ جماد اور میت ہے، حی کامل و مطلق وہ ہے جس کے ادراک کے تحت میں تمام مدرکات اور اس کے فعل کے تحت میں تمام موجودات درج ہوں یہاں تک کہ کوئی قابل ادراک شے اس کے علم سے اور کوئی مفعول اس کے فعل سے خارج نہ ہو اور یہ ساری باتیں خاص خدا کے لئے ہیں لہٰذا وہی مطلق ہے اور اس کے سوا جو شے ہے، اس کی حیات اس کے ادراک اور فعل کے موافق ہے، اور ایسی تمام اشیاء قلت میں محصور ہیں، واضح ہو کہ احیا یعنی زندہ چیزیں متفاوت ہیں پس ان کے مراتب ان کے تفاوت کے موافق ہیں، جیسے کہ ملائکہ انسان اور چاپایوں کے مراتب میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ جل جلالہ:

(کارخانہ عالم کا سنبھالنے والا)، واضح ہو کہ تمام اشیاء کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جو کسی محل کی محتاج ہیں جیسے اعراض اور اوصاف پس ان کی نسبت کہا جاتا ہے، کہ

وہ بنفسہٖ قائم نہیں ہیں، دوم وہ جو کسی محل کی محتاج نہیں ہے پس کہا جاتا ہے کہ وہ بنفسہٖ قائم ہیں جیسے جوہر لیکن جوہر گو قائم بنفسہٖ اور اپنے قیام کے محل سے مستغنی ہے، تاہم ایسے امور سے مستغنی نہیں ہے، جو اس کے وجود کے لئے لازم نہیں پس وہ قائم بنفسہٖ نہیں کہ وہ بنفسہٖ قائم ہیں کیونکہ وہ اپنے قیام میں گو محل کی محتاج نہیں ہیں، مگر کسی اور شے کے وجود کی محتاج ہیں پس اگر کوئی ایسا موجود پایا جاتا ہے جس کی ذات بذاتہٖ مکتفی ہے اور اس کا قیام کسی اور شے کے ساتھ نہیں ہے، اور نہ اس کے سوا کسی اور شے کا وجود اس کے وجود کے دوام کے لئے شرط ہے، وہ مطلقاً قائم بنفسہٖ ہے اور اگر اس کے ساتھ ہی تمام موجودات اس کے ساتھ قائم ہوں یہاں تک تمام اشیاء کا وجود اور دوامِ وجود اس کے ساتھ ہو تو قیوم ہے، کیونکہ اس کا اپنا قیام بذاتہٖ ہے اور ہر شے کا قیام اس کے ساتھ ہے، وہ خدا تعالیٰ ہی ہے، بندہ کا دخل اس وصف میں اتنا ہوتا ہے، جتنا وہ غیر اللہ سے مستغنی ہے۔

اَلْوَاجِدُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(غنی)، واجد وہ ہے جس کے لئے کوئی شے نایاب نہ ہو اور وہ فاقد یعنی تنگدست کا مقابل ہے، اغلب یہ ہے کہ جس کو وہ شے ہات نہ آئی ہو جو اس کے وجود کے لئے ضروری نہیں اس کو فاقد نہیں کہا جاتا اور جس کو وہ شے حاصل ہو سکتی ہے، جو اس کی ذات سے اور اس کی ذات کے کمال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اس کو واجد (غنی) نہیں کہتے بلکہ واجد وہ ہے جس کے لئے کوئی بھی ضروری شے نایاب نہ ہو اور جو امر صفات الٰہیہ اور ان کے کمال کے لئے لازمی ہے وہ اللہ کے لیے موجود ہے، پس وہ اس لحاظ سے واجد ہے اور واجد مطلق ہے اور اس کے سوا دوسری موجودات اگر صفاتِ کمال اور ان کے اسباب میں سے کسی شے کے لحاظ سے واجد ہیں تو بہت سی اشیاء کے لحاظ سے فاقد ہیں اس لئے وہ صرف اضافی طور پر واجد کہلا سکتے ہیں۔

اَلْمَاجِدُ، اَلْوَاحِدُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

الماجد: (بزرگی والا)، یہ اسم مجید کا ہم معنی ہے جیسے عالم علیم کے معنی میں آتا ہے لیکن فعیل کے صیغہ میں مبالغہ پایا جاتا ہے اور مجید کے معنی بیان ہو چکے،
الواحد: تنہا، یگانہ، ایک، یہ وہ ہے جو نہ تقسیم ہو نہ دو ہو سکے، تقسیم نہ ہونے والی چیز کی مثال جیسے جوہر واحد (جزو لایتجزی) اور جو تقسیم نہ ہو اس کو واحد کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی جز نہیں، اسی طرح نقطہ کا کوئی جز نہیں اور اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے کا یہ مطلب ہے، کہ اس کی ذات کا انقسام محال ہے اور جو چیز دو نہ ہو سکے یہ وہ ہے جس کی نظیر نہیں ہے مثلاً سورج کیونکہ وہ اگرچہ جسم کے قبیل سے ہونے کے باعث وہماً منقسم ہو سکتا ہے لیکن اس کی نظیر نہیں ہے، مگر ممکن ہے کہ اس کی نظیر ہو پس اگر کوئی ایسا موجود پایا جائے جو اپنے وجود کی خصوصیت میں اس طرح منفرد ہو کہ کسی اور کا اس میں شریک ہونا متصور ہی نہ ہو سکے وہ ازلاً و ابداً واحد مطلق ہے۔

بندہ اس وقت واحد سمجھا جاتا ہے، کہ اس کے ابنائے جنس میں کسی خاص پسندیدہ خصلت کے اندر کوئی اس کی نظیر نہ ہو اور یہ یکتائی بھی صرف اس کے ابنائے جنس کے لحاظ سے ہوگی اور نیز خاص زمانہ کے لحاظ سے کیونکہ ممکن ہے، کہ کسی دوسرے زمانہ میں اس کی نظیر پیدا ہو جائے نیز یہ یکتائی بعض خصائل کی رو سے ہوگی تمام کی رو سے نہیں پوری وحدت و یکتائی خاص خدا کے لئے ہے۔

اَلصَّمَدُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(بے نیاز)، صمد وہ ہے جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہے، اور ضروریات کے لئے جس کی درگاہ کا قصد کیا جاتا ہے، کیونکہ پیشوائی کے مراتب اس پر ختم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ جس شخص کو دینی و دنیوی مہمات میں اپنے بندوں کا مرجع بنا دیتا ہے اور اس کی زبان اور ہاتھوں سے اپنے بندوں کی حاجتیں پوری کراتا ہے، تو اس کو اس اسم کے معنی سے اس نے حصہ بخشا ہے لیکن صمد مطلق وہ ہے کہ تمام حوائج میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اور وہ خاص اللہ تعالیٰ ہے۔

اَلْقَادِرُ، اَلْمُقْتَدِرُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

القادر (قدرت والا)، المقتدر: (صاحب مقدرت)، ان دونوں اسموں کے معنی ہیں صاحب قدرت، لیکن مقتدر میں زیادہ مبالغہ ہے، قدر سے مراد وہ معنی ہے جس سے کوئی چیز ارادہ اور علم کی تقدیر سے اور ان دونوں کے اقتضا کے موافق موجود کی جاسکے اور قادر وہ ہے جو اگر چاہے تو کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے اور اس کے لئے شرط نہیں کہ وہ ضرر کرنا ہی چاہے اللہ تعالیٰ اسی وقت قیامت کرنے پر قادر ہے، اگر وہ چاہے ابھی برپا کرے اگر برپا نہیں کرتا تو اس لئے کہ وہ برپا نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ پہلے اس کے علم میں اس کی میعاد اور وقت مقدر ہو چکے ہیں پس اس سے قدرت میں کوئی نقص نہیں آتا اور قادر مطلق وہ ہے جو ہر موجود کو از سر نو بناتا ہے، اور کسی دوسرے کی امداد سے مستغنی ہوتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔

بندہ کو بھی کچھ نہ کچھ قدرت ہے لیکن وہ ناقص ہے کیونکہ وہ صرف بعض ممکنات کو حاوی ہوتی ہے اور کسی چیز پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے، بلکہ بندہ کے مقدور میں جو امور ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے پیدا کرتا ہے، جب کہ اس کے مقدور کے تمام اسباب وجود مہیا ہو جائے ہیں، یہ مقام ایک باریک بحث چاہتا ہے، (جو آگے مذکور ہوگی)۔

اَلْمُقَدِّمُ، اَلْمُؤَخِّرُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

المقدم: (اپنے دوستوں کو بارگاہ عزت کی طرف بڑھانے والا) المؤخر: (اپنے دشمنوں کو اپنے لطف سے پیچھے ہٹانے والا)، مقدم و موخر وہ ہے جو قریب و بعید کرتا ہے، جس کو قریب کرتا ہے، اس کو مقدم کرتا ہے، جس کو دور ہٹاتا ہے اس کو موخر کرتا ہے وہ انبیاء اولیاء کو قرب بخشنے اور راہ راست پر چلانے کے لئے مقدم کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو دور ہٹا کر اور اپنے اور ان کے درمیان پردہ ڈال کر موخر کر دیتا ہے مثلاً جب ایک بادشاہ دو شخصوں کو اپنا قرب بخشے لیکن ان میں سے ایک کو

اپنی طرف زیادہ قریب کرے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو مقدم کیا یعنی اس کو دوسرے شخص کے آگے رکھا یہ تقدیم کبھی مکان میں ہوتی ہے خ اور کبھی رتبہ میں اور بہر حال پیچھے رہنے والے کے لحاظ سے ہوتی ہے، اور ایک ایسے مقصد کا ہونا بھی لابدی ہے، جو اصلی غرض وغایت ہو جو مقدم ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے جو متاخر ہوتا ہے، اسی کی طرف سے مقصد اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ کی طرف اس کے مقرب ہیں چنانچہ اس لئے پہلے ملائکہ کو تقدیم بخشی ہے پھر انبیاء کو پھر اولیا کو پھر علما کو اور ہر متاخر اپنے ماقبل کے لحاظ سے موخر ہوتا ہے، اور اپنے مابعد کی نسبت سے مقدم ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی یہ تقدیم وتاخیر دینے والا ہے، کیونکہ اگر آپ ان کے تقدم وتاخر کو ان کے فضائل کی کثرت وقلت اور ان کی صفات کے کمال ونقصان پر موقوف سمجھو تو آخر وہ ذات بھی کوئی ہے جس نے ان کو علم وعبادت کی ترقی کے لیے بنایا ہے یا جس نے صراط مستقیم کے برخلاف چلنے پر ان کو آمادہ کیا ہے، اور یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ ہی کی شان کی ہیں، لہٰذا وہ مقدم اور موخر ہے اور اس میں رتبہ کی تقدیم اور تاخیر مراد ہے، اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ جو شخص علم وعمل میں سبقت کر جائے وہ صرف اسی سے متقدم نہیں ہوسکتا بلکہ خدا اس کو تقدیم بخشے تو وہ متقدم ہوسکتا ہے یہی حال متاخر کا ہے، اور اللہ کے یہ دو قول اس امر کی کافی تصدیق کرتے ہیں ان الذین سبقت لھم منا الحسنی اولیك عنھا مبعدون: یعنی جن لوگوں کے لیے ہماری خیر خواہی نے قدم بڑھایا، وہ دوزخ سے دور رہیں گے۔ (۲) ولو شیئا لا تینا کل نفس ھدی ھا ولکن حق القول منی لا ملئن جھنم یعنی اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت پر چلاتے مگر ان کی نسبت میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے، کہ ضرور دوزخ کو پر کروں گا، صفات افعال سے بندہ کا حصہ ظاہر ہی ہے، اس لیے ہم بخوف تطویل ہر اسم کے بیان میں اس کا اعادہ کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ بیانات سابقہ سے اس بات کا بخوبی پتہ مل سکتا ہے۔

اَلْاَوَّلُ، اَلْاٰخِرُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

الاول (سب سے پہلا)، الآخر: (سب سے پچھلا)، واضح ہو کہ اول کسی شے کی نسبت سے اول ہوتا ہے اور آخر بھی کسی شے کی نسبت سے آخر ہوتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے متناقض ہیں پس ایک ہی چیز ایک ہی جہت سے ایک ہی چیز کی نسبت سے اول اور آخر نہیں ہوسکتی بلکہ جب تم وجود کی ترتیب پر نظر کرو اور موجودات کے باترتیب سلسلہ کو غور سے دیکھو تو اللہ ان کے لحاظ سے اول ہے کیونکہ تمام موجودات نے اس سے وجود حاصل کیا ہے، اور وہ خود موجود بذاتہٖ ہے، اور اس نے کسی سے وجود حاصل نہیں کیا، اور جب ترتیب سلوک پر نظر کی جائے اور خدا کی طرف سیر کرنے والوں کی منزلوں کو دیکھا جائے، تو وہ آخر ہے، کیونکہ اس کی درگاہ عافین کے مدارج ترقی کی سب سے آخری منزل ہے، اور اس کی معرفت سے قبل جو معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ اس کی معرفت کا زینہ ہے اور آخری منزل اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اس لیے وہ اولیاء کے سیر وسلوک کے لحاظ سے آخر ہے اور موجودات کے وجود کے لحاظ سے اول ہے، پس اول اسی کی طرف سے آغاز ہے اور آخر اسی کی طرف انجام اور انتہا ہے۔

اَلظَّاهِرُ، اَلْبَاطِنُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

الظاھر: (آشکارا، بلحاظ قدرت)، الباطن: (پوشیدہ بلحاظ فراست) یہ دونوں وصف بھی اضافی ہیں کیونکہ ظاہر ایک شے کے لئے ظاہر اور ایک شے کے لئے باطن ہوتا ہے ایک ہی جہت سے ظاہر و باطن نہیں ہوتا بلکہ ادراک کی طرف نسبت کرنے سے ایک جہت سے ظاہر اور دوسری جہت سے باطن ہوتا ہے، وجہ یہ کہ ظاہر و باطن ہونا ادراکات کی طرف نسبت کرنے سے ہوا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو اگر حواس کے ادراک سے طلب کیا جائے تو وہ باطن ہے، اور اگر عقل سے بطریق استدلال معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ظاہر ہے سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ادراک حواس کی نسبت سے باطن ہونا تو ظاہر ہے لیکن عقل کی جہت سے ظاہر ہونا ذرا باریک بات ہے کیونکہ ظاہر تو وہ بات ہوتی ہے، جس کے ادراک میں لوگ اختلاف نہ کرتے ہوں بخلاف اس کی خدا کی ذاتکو معلوم کرنے میں، بہت سے لوگ شک میں گرفتار ہیں پس اس کو کیونکر ظاہر کہا جاسکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے اللہ تعالیٰ کا مخفی ہونا اس کے شدت ظہور کے باعث ہے، اس کا ظہور اس کے باطن ہونے کا موجب ہے، گو یا اس کا نور ہی اس کے نور کا حجاب ہے، شاید تم اس کلام سے تعجب ظاہر کرو لہٰذا ہم ایک مثال سے تم کو سمجھاتے ہیں دیکھو اگر تم کسی حرف پر نظر ڈالو جو کسی کاتب نے لکھا ہو، تو

اس سے تم کو ایک ایسے کاتب کے وجود کا پتہ ملے گا، جو عالم قادر سمیع اور بصیر ہے اور اس سے تم کو کاتب کی ان صفات کا یقین کامل ہو جائے گا۔ اور جس طرح اس ایک حرف نے کاتب کے اوصاف کی فیصلہ کن شہادت دی ہے اسی طرح آسمان و زمین کی جو چیز ستارے سورج چاند حیوانات نباتات اور صفت موصوف وغیرہ ہے، جو خود بخود اپنے ایک ایسے مدبر کا پتہ دے رہی ہے جس نے اس کا اہتمام کیا ہے اور اس کو خاص اندازہ پر اور خاص صفات کے ساتھ بنایا بلکہ انسان اپنے جس عضو اور جس ظاہر یا باطن جزو بلکہ جس اختیاری یا جبری صفت و حالت کو دیکھتا ہے وہ چلا چلا کر اپنے خالق اپنے مالک مختار اور اپنے مدبر کا پتہ بتا رہی ہے اسی طرح ہر چیز اس کی شہادت دیتی ہے جس کو انسان اپنی ذات سے خارج دیکھتا ہے، اگرچہ ان اشیاء کی شہادتوں میں اختلاف ہو بعض شہادت دے رہی ہوں اور بعض نہ دیتی ہوں تاہم سب کو ان شہادتوں سے یقین حاصل ہو سکتا ہے لیکن چونکہ یہ شہادتیں بکثرت ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں اس لئے وہ امر شدت ظہور کے باعث مخفی اور باریک بن گیا ہے، جس کی مثال یہ ہے کہ جو اشیاء حواس کے ذریعہ سے محسوس کی جاتی ہیں، ان میں سے زیادہ ظاہر وہ چیزیں ہیں جو آنکھ سے محسوس ہوں اور آنکھ کی محسوسات میں سے بھی زیادہ روشن اور ظاہر سورج کا نور ہے جو تمام اشیاء پر منعکس ہو کر ان کو روشن کر رہا ہے اور جو شے دوسری اشیاء کو روشن کر رہی ہے، وہ خود روشن کیوں نہ ہو گی، مگر اس کا روشن ہونا بہت سے لوگوں پر مخفی ہے، حتیٰ کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ رنگ دار اشیاء میں صرف سرخ و سیاہ رنگ ہے اور کچھ نہیں، وہ اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ رنگ کے ساتھ روشنی اور نور بھی شامل ہے اور یہ لوگ رنگین اشیاء کے ساتھ روشنی کا قائم ہونا اس وقت تسلیم کرتے ہیں، جب ان کو سایہ اور اندھیرے میں روشنی میں اشیاء کی مختلف حالتوں کا فرق دکھایا جاتا ہے، چنانچہ رات کے وقت جب سورج چھپ جاتا ہے اور اس کی روشنی رنگین چیزوں سے منقطع ہو جاتی ہے، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت ان چیزوں کی کیا صورت ہے اور دن میں کیا تھی گویا نور کی غیر موجودگی میں نور کے وجود کا پتہ لگتا ہے اور نور کے وجود و عدم میں صاف فرق ہو جاتا ہے، فرض کرو کہ ایک شخص سورج کی روشنی تمام اشیائے عالم پر پڑتی دیکھتا ہے اور سورج اس کی زندگی کے اندر اندر کبھی غروب نہیں ہوتا حتیٰ کہ کبھی اس کو یہ موقع نہیں ملا کہ ان اشیاء

کواندھیرے میں دیکھے اور روشنی اور اندھیرے میں فرق سمجھے اس شخص کے لئے محال ہے کہ نور کو کوئی خاص چیز سمجھے جو موجودہ اشیا کی رنگت سے زائد ہے تمام اشیاء سے زیادہ ظاہر وہی چیز ہے، بلکہ وہی تمام اشیاء کو ظاہر کرتی ہے، اور اگر خدا کا بعض امور کے لئے (معاذ اللہ) معدوم یا غائب ہونا فرض کیا جائے تو آسمان و زمین اور ہر چیز جس سے وہ بے تعلق ہے منہدم ہو جائے گی اور پھر ان دونوں حالتوں کا فرق بخوبی معلوم ہو جائے گا اور اس کا وجود قطعی طور پر معلوم ہو جائے گا، چونکہ تمام اشیاء شہادت اور حالات میں متفق ہیں اور سب ایک ہی نظم و نسق پر اپنی آواز اٹھا رہی ہیں، اس لیے وہ عام نظروں سے مخفی ہے، قربان جایئے اس ذات پاک کے جو اپنے نور ہی کے باعث مخلوق کی نظروں سے نہاں اور اپنے شدت ظہور کے سبب سے مخفی ہے وہ ایسا ظاہر ہے جس سے بڑھ کر کوئی شے ظاہر نہیں وہ ایسا باطن ہے جس سے زیادہ کوئی چیز باطن نہیں ہو سکتی، اوپر کی باتوں سے تم کو خدا کی صفات کے متعلق تعجب میں مبتلا نہ ہو جانا چاہیے، کیونکہ خود انسان جس امر کی بدولت انسان کہلاتا ہے، وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اگر اس کو انسان مناسب اور مرتب افعال کے ذریعہ سے سمجھا جائے تو وہ ظاہر ہے اگر حس کے ادراک کے ذریعہ سے طلب کیا جائے تو وہ باطن ہے، کیونکہ حس صرف اس کے ظاہر بشرہ کو محسوس کر سکتی ہے اور انسان صرف ظاہری بشرہ سے انسان نہیں کہلاتا بلکہ اگر یہ بشرہ بلکہ اس کے تمام اعضاء بدل جائیں، تو بھی وہ وہی انسان رہے گا جو پہلے تھا اور تعجب نہیں کہ انسان کے بدنی اعضاء بچپن میں اور ہوتے ہیں اور پھر بڑھاپے میں اور ہوتے ہیں کیونکہ وہ طول زمان سے گھٹتے بڑھتے جاتے ہیں، اور ان کی جگہ نئے اجزا جو غذا کے ذریعہ سے پیدا کئے جاتے ہیں، شامل ہوتے جاتے ہیں، تاہم انسان کی سابقہ ہیئت نہیں بدلتی پس یہ ہیئت حواس سے باطن ہے، اور عقل کے لئے ظاہر ہے جو اس کے آثار و افعال سے سمجھ لیتی ہے۔

اَلْبَرُّ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(اپنے لطف کے ساتھ بندوں سے نیکی کرنے والا) بر: کے معنی محسن ہیں اور بر مطلق وہی ہے جس کی طرف سے تمام نیکیاں اور احسانات ظہور میں آتے ہیں، اور بندہ اسی قدر بر ہے جس قدر کہ نیکی کرتا ہے، خصوصاً اپنے والدین استاد اور اپنے شیوخ کے ساتھ۔

اَلتَّوَّابُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(گنہگاروں کی توبہ قبول کرنے والا)، تواب وہ ہے جو بندوں کے لئے ایسے اسباب مہیا کرتا ہے، کہ وہ اس کی نشانیاں دیکھ کر بار بار اس کی طرف رجوع اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور جو ان کی طرح طرح کی تنبیہات سے خبردار کرتا ہے، اور ڈرا دھمکا کر اپنی راہ پر لاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کو پہچان کر اپنی تقصیرات اور گناہوں کا احساس کرتے ہیں، تو دھمکی سے خوف کھاتے ہیں، اور توبہ کرنے لگتے ہیں اور خدا اپنے فضل سے ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، جو حاکم اپنی مجرم رعایا کی درخواست رحم کو منظور کرتا ہے، اور جو دوست اپنے خطا کار رفیق کا عذر قبول کرتا ہے وہ اس اسم سے بہریاب ہے۔

اَلْمُنْتَقِمُ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(نافرمانوں سے بدلہ لینے والا)، منتقم وہ ہے جو سرکشوں کی گردنیں توڑتا اور باغیوں کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے اور اس کی یہ سخت گیری اس وقت ہوتی ہے جب وہ اتمام حجت کر چکتا ہے، اور نافرمانوں کو باز آنے کے لئے مہلت و قدرت دے لیتا ہے، ایسا انتقام فوری عذاب کی بہ نسبت زیادہ سخت ہوتا ہے کیونکہ اگر فی الفور عذاب نازل کیا جائے، تو نافرمان پورے طور پر گناہ میں غرق نہ ہوگا اور اس سے وہ انتہائی عذاب کا مستوجب قرار نہ پائے گا، بندہ کا مبارک انتقام یہ ہے کہ اللہ کے دشمنوں سے انتقام لے اور تمام دشمنوں سے زیادہ دشمن نفس ہے، پس جب وہ کسی گناہ کے قریب ہو جائے یا کسی عبادت کے کام میں سستی کرے تو اس کو سزا دینی چاہیے۔

اَلْعَفُوُّ جَلَّ جَلَالُہٗ:

(گناہوں کو مٹانے والا) عفو وہ جو گناہوں کو مٹا دیتا ہے، اور تقصیرات سے درگذر کرتا ہے اور غفور کے قریب قریب ہے، لیکن عفو میں زیادہ مبالغہ ہے، کیونکہ

غفران میں پردہ ڈالنے کے معنی شامل ہیں، اور عفو میں مٹا دینے کے معنی داخل ہیں اور مٹا دینا پردہ ڈالن کی نسبت ابلغ ہے، اس اسم سے بندہ کا حصہ مخفی نہیں ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اس پر ظلم کرے، وہ اس کو معاف کرے بلکہ اس کے ساتھ احسان کرے جس طرح اللہ تعالیٰ دنیا میں سرکشوں اور کافروں کے ساتھ احسان کررہا ہے اوران پر فی الفور عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ کبھی ان کو توبہ پر اکساتا ہے اور جب وہ لوگ توبہ کرتے ہیں تو ان کے گناہ مٹا دیتا ہے۔

اَلرَّءُوْفُ جل جلالہ:

(بہت شفقت کرنے والا)، رؤف کے معنی صاحب رافت اور رافت حد درجہ کی رحمت کو کہتے ہیں، پس وہ رحیم کا ہم معنی ہے مگر اس میں کسی قدر مبالغہ بھی شامل ہے، اور رحیم کا ذکر گزر چکا ہے۔

مَالِكُ الْمُلْكِ جل جلالہ:

(ملک کا مالک)، مالک الملک وہ ہے جو اپنے ملک میں جس طرح چاہتا ہے، حکم جاری کرتا ہے جسے چاہتا ہے جلاتا ہے جسے چاہتا ہے مارتا ہے، اس اسم میں ملک کے معنی مملکت کے ہیں اور مالک کے معنی پوری قدرت والا اور تمام موجودات ایک مملکت ہیں جن کا وہ مالک اور سب پر قادر ہے موجودات سب کی سب ایک مملکت ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، گو ایک جہت سے وہ اشیاء بکثرت ہیں مگر دوسری جہت سے ان میں وحدت پائی جاتی ہے، اور اس کی

مثال بدن انسانی ہے جو انسان کی ایک مملکت ہے، اور اس میں بہت سے اعضا اور اجزاء پائے جاتے ہیں، لیکن وہ سب کے سب صرف اپنے ایک مدبر کی غرض پوری کرنے میں ایک دوسرے کی مدد و اعانت میں مصروف ہیں لہٰذا ان سب کا مجموعہ گویا ایک مملکت ہے، اسی طرح تمام عالم گویا ایک ہی وجود ہے، اور عالم کے اجزاء اس کے اعضا ہیں جو ایک ہی مقصود پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وجود الٰہی کے موافق جس چیز کا حاصل ہونا ممکن ہو وہ حاصل ہو جائے اور وہ ایک ہی مملکت اس لئے ہے، کہ اس کے تمام کاروبار ایک ہی نظم و نسق کے سلسلہ میں مرتبط ہیں، اور صرف اللہ اس مملکت کا مالک ہے، اور ہر بندہ کی مملکت اس کا وجود ہے۔ اور چونکہ صفات قلب اور جوارح میں اس حکم جاری رہتا ہے، اس لیے وہ اپنی قدرت حاصلہ کے موافق اس اپنی مملکت کا مالک ہے۔

ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامُ جل جلالہ:

(بزرگی اور عزت والا)، یہ وہ ذات ہے جو تمام جلال و کمال کی واحد سزاوار ہو، اور تمام کرامت و مکرمت اسی سے صادر ہو، پس وہ جلال کی سزاوار فی ذاتہٖ ہے، اور کرامت اس کی طرف سے خلقت کو پہنچتی ہے، خلقت کے حق میں اس کی جو کرامت ہے وہ شمار نہیں کی جا سکتی، اس کا یہ ارشاد اس کرامت پر دلالت کرتا ہے، ولقد کرمنا بنی آدم: یعنی اور ہم نے بنی آدم کو معزز کیا۔

اَلْوَالِیُ جل جلالہ:

(تمام امور کا متولی)، یہ وہ ہے جو تمام خلقت کے ہر قسم کے امور کا مدبر اور متولی ہے، اور ولائت تدبیر اور قدرت اور فعل چاہتی ہے اور جب تک اس کے لئے یہ تمام اوصاف جمع نہ ہوں، اس پر اسم والی صادق نہیں آ سکتا اور تمام امور کا والی خاص اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ پہلے وہ اکیلا تدبیر کرتا ہے، اور پھر اکیلا ہی اس تدبیر کو جاری کرتا ہے اس کے بعد خود ہی اس کو جاری رکھتا ہے۔

اَلْمُتَعَالِیُ جل جلالہ:

(مخلوقات کی صفات سے منزہ)، یہ اسم علی کا معنی ہے، مگر اسمیں ساتھ یہی کسی قدر مبالغہ شامل ہے۔

اَلْمُقْسِطُ جل جلالہ:

(عادل ومنصف)، مقسط وہ ہے جو مظلوم کو ظالم سے داد دلاتا ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ مظلوم کی خوشنودی کے ساتھ ظالم کی خوشنودی بھی شامل کر دے اور یہ اعلیٰ درجہ کا عدل وانصاف ہے جس پر خدا کے سوا اور کوئی قادر نہیں اس اسم میں سے بندہ کا اعلیٰ حصہ یہ ہے کہ پہلے اپنے نفس سے انصاف دلائے پھر کسی دوسرے شخص سے کسی اور شخص کو انصاف دلائے، اروا پنے نفس کو کسی ذات سے انصاف نہ دلائے۔

اَلْجَامِعُ جل جلالہ:

(مخلوقات کو جمع کرنے والا)، جامع وہ ہے جو ملتی جلتی چیزوں کو جدا جدا چیزوں سے ایک دوسرے کی مخالف چیزوں کو باہم ملا دے ملتی جلتی چیزوں کو جمع کرنے کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے انسان زمین پر جمع کیے ہیں، اور پھر سب کو حشر کے میدان میں جمع کرے گا، جدا جدا چیزوں کو جمع کرنے کی مثال جیسے کہ اس نے آسمانوں، ستاروں، ہوا، زمین، دریا، حیوانات، نباتات، اور مختلف معاون کو جمع کیا ہے اور یہ تمام اشیاء شکل میں رنگ میں ذائقہ میں اور دیگر تمام اوصاف میں ایک دوسرے سے متبائن ہیں، اسی طرح اس نے ہڈی، پٹھے، رگ عضلہ، مغز، جلد، خون اور تمام اخلاط کو حیوان کے بدن میں جمع کیا ہے، یہ چیزیں بھی سب کی سب باہم متبائن ہیں، ایک دوسرے کے مخالف اشیاء کو باہم ملانے کی مثال جیسے اس نے حرارت برودت رطوبت یبوست کو حیوانات کے مزاج میں جمع کیا ہے، حالانکہ یہ اشیاء باہم متنافر اور ایک دوسرے پر غلبہ کرنے والی ہیں، اور جمع کرنے کی صورتوں میں سے یہ اعلیٰ درجہ کی صورت ہے، خدا کے جمع کرنے کی تفصیل وہی شخص معلوم کر سکتا ہے، جو اس کی پیدا کردہ اشیاء کی تفصیل جانتا ہو، اور اس بات کی شرح طویل ہے۔ بندوں میں سے جامع وہ ہے جو نشست و برخاست وغیرہ کے ظاہری آداب کے ساتھ قلب کے باطنی حقائق کو جمع کرے پس جس شخص کی معرفت کامل اور سیرت پسندیدہ ہو وہ جامع ہے اس لئے کہا جاتا ہے، کہ کامل وہ ہے جس کا نور معرفت اس کے تقوے کے نور کو بجھا نہ سکے، صبر اور بصیرت کو جمع کرنا تقریباً محال ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جس شخص کو زہد وتقویٰ پر صبر حاصل ہے، اس میں باطنی روشنی نہیں ہے، اور جس میں باطنی روشنی ہے اس میں صبر نہیں، جامع وہ ہے جو اپنے آپ میں صبر اور بصیرت جمع کرے۔

اَلْغَنِیُّ، اَلْمُغْنِی جل جلالہ:

الغنی: (بے پردہ)، المغنی: (لوگوں کو بے پرواہ کرنے والا)، یہ وہ ہے جس کو اپنی ذات صفات میں کسی غیر سے تعلق نہیں ہے، بلکہ اغیار کے ساتھ علاقہ رکھنے سے وہ پاک ہے پس جس شے کی ذات یا صفات کسی ایسے رو سے متعلق ہو، جو اس کی ذات سے خارج ہو، اس شے کا وجود یا کمال اس خاری امر پر موقوف ہے، پس وہ محتاج اور فقیر ہے جس کو طلب وکسب کی ضرورت ہے ایسی بے تعلقی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ مغنی بھی ہے یعنی غنی بھی کر دیتا ہے، مگر جس کو وہ غنی بناتا ہے، اس کا مطلق غنی بن جانا متصور نہیں ہو سکتا، کم از کم وہ مغنی کا تو محتاج ہوا، پس غنی مطلق کہاں بلکہ غیر اللہ سے بھی مستغنی ہوتا ہے، تو اس لحاظ سے کہ اس کی تمام ضروریات خدا مہیا کر دیتا ہے، نہ بایں معنی کہ اس کو کوئی حاجت ہی نہیں رہتی اور غنی حقیقی تو وہ ہوتا ہے جس کو کسی کی حاجت قطعاً نہیں ہوتی، اور جو شے محتاج ہے اور اپنی حاجت کی چیزیں حاصل کر رہی ہے، وہ مجازاً غنی ہے، غیر اللہ کے حق میں زیادہ سے زیادہ جو صورت تسلیم کی جا سکتی ہے، وہ صرف یہی ہے تاہم جب اس کو خدا کے سوا کسی کی حاجت نہیں رہتی تو اس کو غنی کہا جاتا ہے اگر یہ ہو سکتا ہے کہ اصل حاجت بھی اس کے ساتھ لگی نہ رہے تو خدا کا یہ

فرمان (معاذ اللہ) صحیح نہ ہوتا۔ اللہ الغنی وانتم الفقراء یعنی اللہ غنی ہے، اور تم سب محتاج ہو اور اگر یہ تصور کرنا صحیح نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی تمام اشیاء سے مستغنی ہوسکتے ہیں تو خدا کے لئے مغنی کا وصف (معاذ اللہ) درست نہ ہوتا۔

اَلْمَانِعُ جل جلالہ:

(اپنے دوستوں کو تکلیف سے روکنے والا)، مانع وہ ہے جو حفاظت کے خاص خاص اسباب مہیا کر کے ادیان وابدان کے نقصان وہلاکت کے اسباب دور کرتا ہے، اور حفیظ کے معنی بیان ہو چکے ہیں، حفظ کے لئے منع اور دفع ضروری ہے، پس جو شخص حفیظ کے معنی سمجھتا ہے وہ مانع کے معنی بھی سمجھ سکتا ہے، فرق اتنا ہے، کہ منع سبب مہلک کی طرف نسبت کرنے سے ہے جو ہلاکت سے محفوظ ہے وہ منع سے مقصود ہے خلاصہ یہ ہے چونکہ منع کا فعل حفظ کے لئے کیا جاتا ہے اور حفظ کا فعل منع کے لئے نہیں کیا جاتا ہے لہٰذا ہر حافظ وافع ومانع ہے لیکن ہر مانع کا حافظ ہونا ضروری نہیں مگر اس وقت جب کہ وہ تمام اسباب ہلاک ونقص کا مانع مطلق ہو جس سے حفظ کا حاصل ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔

اَلضَّارُّ، اَلنَّافِعُ جل جلالہ:

الضار جل جلالہ: (ضر وشر کا خالق) النافع جل جلالہ: (نفع وخیر کا پیدا کرنے والا) یہ وہ ہے جس سے خیر وشر اور نفع وضر صادر ہوتے ہیں، اور یہ تمام خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہیں، یا تو وہ ان امور کا اجرا ملائکہ، انسان اور جمادات کے ذریعہ سے کرتا ہے، یا بلا واسطہ خود کرتا ہے، پس یہ نہ سمجھنا کہ زہر خود بخود مار ڈالتا ہے، اور طعام خود بخود سیر کر دیتا ہے، اور نہ یہ خیال کرنا کہ فرشتے، انسان، شیطان یا کوئی اور مخلوق مثلاً فلک، ستارہ یا دوسری چیز خود بخود نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے، بلکہ یہ تمام اشیاء اسباب مسخر ہیں جو صرف وہی کام کرسکتے ہیں جن پر وہ مامور ہیں اور یہ تمام امور قدرت ازلیہ کے تعلق سے ہیں، جیسے عام لوگوں کے اعتقاد میں قلم کاتب کے ساتھ تعلق رکھنے کی حیثیت سے ہے مثلاً سلطان جب کسی انعام یا سزا کے حکم نامہ پر دستخط کرتا ہے، تو اس کا ضرر یا نفع قلم کی طرف سے نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان لوگوں کی طرف سے سمجھا جاتا ہے جن کے قبضہ میں قلم ہے، اسی طرح تمام وسائط اور اسباب کا حال ہم نے عام لوگوں کے خلای میں اس لئے کہا کہ جاہل آدمی ہی قلم کو کاتب کا مسخر سمجھتا ہے اور عارف جانتا ہے، کہ قلم خدا کا مسخر ہے جس کی تسخیر میں خود کاتب بھی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کاتب کو پیدا کیا اور اس کو لکھنے کی قدرت دی اور ساتھ ہی اس کے دل میں لکھنے کی ایسی پکی خواہش بھی ڈال دی جس میں کوئی تردد نہیں تو خواہ مخواہ اس کی انگلیوں اور قلم میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ وہ اس کے خلاف ہرگز نہیں کرسکتا پس دراصل کاتب خدا ہے، جو انسان کے قلم اور اس کے ہاتھ کے ذریعہ لکھتا ہے جب تم انسان کے متعلق یہ بات سمجھ چکے تو جمادات کے متعلق خود بخود سمجھ سکتے ہیں۔

اَلنُّوْرُ جل جلالہ:

(روشن کرنے والا)، یہ وہ ذات ظاہر ہے جس سے تمام اشیاء کا ظہور ہے، کیونکہ جو چیز فی نفسہ ظاہر ہو اور دوسری اشیاء کو ظاہر کرنے والی ہو اس کا نام نور ہے، اور جب وجود کا مقابلہ عدم سے کیا جائے تو یقیناً وجود ہی میں پورا ظہور پایا جائے گا، اور عدم سے بڑھ کر کوئی اندھیرا نہیں ہوسکتا پس جو عدم کی تاریکی سے بلکہ عدم کے امکان سے بھی بری ہے اور تمام اشیاء کو عدم کی تاریکی سے نکال کر وجود کی روشنی میں لاتا ہے، وہ سب سے زیادہ نور کہلانے کا مستحق ہے، وجود ایک نور ہے جو اس کی ذات کے نور سے تمام اشیاء کو حاصل ہے پس وہ آسمان وزمین کا نور ہے اور جیسے زمین کا ذرہ ذرہ سورج کے وجود پر دال ہے اسی طرح نور آسمان زمین کی موجودات میں سے ذرہ ذرہ اپنے وجود کے جواز سے اپنے موجد کے وجود کے وجوب پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ ہم اسم ظاہر کے بیان میں لکھ چکے ہیں، اس سے نور کے معنی بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں، اور اس کے معنوں کے بیان میں جو فضول موشگافیاں کی گئی ہیں ان کی ضرورت نہ رہے گی۔

اَلْهَادِیُ جل جلالہ:

(ہدایت کرنے والا)، ہادی وہ ہے جو اپنے خاص خاص بندوں کو اپنی ذات کی شناخت کا راستہ بتا تا ہے، حتیٰ کہ وہ اس کی ذات سے اشیاء پر دلیل قائم کرتے ہیں، اور عام بندوں کو مخلوقات کی طرف ہدایت دیتا ہے، حتیٰ کہ وہ مخلوقات سے اس کی ذات پر دلیل ٹھہراتے ہیں، اور ہر مخلوق کو اپنی ضروری حاجتوں کے پورے کرنے کی سمجھ دیتا ہے، چنانچہ بچہ کو پیدا ہوتے ہی پستان کو منہ میں لینے کا ڈھنگ بتا دیتا ہے، اور پھر چوزے کو اس کے انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنے کا طریقہ سکھا دیتا ہے، شہد کی مکھی کو ایسے شش پہلو خانوں کے گھر بنانے کا طریقہ سکھا تا ہے، جو اس کے جسم کے اس طرح سما جانے ک لئے کہ اگر دگرد کچھ خالی جگہ نہ رہے تمام صورتوں سے زیادہ مناسب ہے یہ تفصیل بڑی لمبی ہے، خداے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے- الذی اعطیٰ کل شی خلقه ثم هدیٰ: یعنی خدا وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی بناوٹ عطا فرمائی پھر اس کو راہ دکھائی اور والذی قدر فھدیٰ، یعنی جس نے ہر چیز کا اندازہ کیا پھر ہدایت کی، بندوں میں ہادی، انبیاء، اور

علماء ہیں جو مخلوقات کو سعادت اخرویہ کی طرف لیے جاتے ہیں، اور صراط مستقیم پر چلاتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان کی زبانی ہدایت کرتا ہے اور وہ اس کی قدرت و تدبیر کے تحت کام کرتے ہیں۔

اَلْبَدِیْعُ جل جلالہ:

(موجد)، بدیع وہ ہے جن کی کوئی مثال نہ گزری ہو پس اگر ذات صفات اور افعال میں اور اس کے متعلقہ ہر امر میں اس کی کوئی مثل نہ گزری ہو تو وہ بدیع مطلق ہے اور اگر کوئی اس قسم کی شے گزر چکی ہو وہ بدیع مطلق نہیں رہے گا، یہ اسم مطلقاً خدا سے خاص ہے، کیونکہ اس کے ساتھ قبل (پہلے) کا معنی کوئی بھی نسبت نہیں رکھتا پس کوئی اس جیسی چیز اس سے پہلے کیونکر موجود ہوئی ہے اور اس کے بعد جو چیز موجود ہوئی ہے وہ اس کی ایجاد سے بنی ہے اور وہ اپنے موجد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، وہ ازلاً و ابداً بدیع ہے، بندوں میں سے جو شخص نبوت یا ولایت یا علم میں ایسی فوقیت حاصل کرے کہ اس کی نظیر سابق میں نہ گزری ہو یا اس کے زمانے میں کوئی، اس کی نظر موجود نہ ہو تو اپنے مخصوص اوصاف میں خاص زمانہ کے اندر بدیع ہے۔

اَلْبَاقِیْ جل جلالہ:

(باقی رہنے والا)، یہ وہ موجود ہے، جو بذاتہٖ واجب الوجود ہے، لیکن جب اس کو ذہن میں مانہ مستقبل کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ باقی کہلائے گا اور جب زمانہ ماضی سے نسبت دی جائے تو اس کو قدیم کہا جائے گا، باقی مطلق وہ ہے، جس کے وجود کی تقدیر زمانہ مستقبل میں کسی آخری حد تک منتہی نہ ہو جس کے لئے یہ لفظ مقرر ہیں کہ وہ ابدی ہے، اور قدیم مطلق وہ ہے جس کے زمانہ میں وجود کی درازی کا ماضی میں کوئی آغاز نہیں اور اس کے لئے یہ لفظ مقرر ہے کہ وہ ازلی ہے جب تم تسلیم کرتے ہو کہ وہ لذاتہٖ واجب الوجود ہے، تو یہ تمام معنی اس میں آجاتے ہیں، یہ اسماء جو مقرر کیے گئے ہیں، تو ذہن میں اس وجود کو ماضی و مستقبل کی طرف منسوب کرنے سے پیدا ہوئے ہیں، ماضی و مستقبل کے مفہوم میں متغیرات کا معنی شامل ہے اس لیے کہ وہ دونوں زمانے ہیں اور زمانہ میں حرکت و تغیر اور متغیر تغیر کے واسطہ سے زمانہ میں داخل ہوتا ہے پس جو ذات تغیر اور حرکت سے بالاتر ہے، وہ زمانہ میں سے نہیں ہے، اور نہ اس میں ماضی و استقبال ہے، یہ امور تو ہمارے ہی لیے ہیں جن پر زمانہ گذرتا ہے، اب کچھ اور حالت ہے پھر کچھ اور ہو گی اس کے بعد کچھ اور ہو جائے گی، یہاں تک کہ جو حالت گذر چکی ہے، وہ ماضی، جو موجود ہے وہ حال، اور جو آنے والی ہے، مستقبل کہلاتی ہے اور جہاں نہ آغاز ہے نہ انجام، وہاں زمانہ ہی نہیں اور کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ ہی نے تو زمانہ کو پیدا کیا ہے، پس وہ زمانہ سے پیشتر ہے اور زمانہ سے بعد جوں کا توں رہے گا، (کیونکہ زمانہ مقدار حرکت کو کہتے ہیں)، کسی کا یہ خیال بالکل دور از عقل ہے، کہ بقا کی صفت باقی کی ذات سے زائد ہے اور اس سے بھی زیادہ بعید خیال یہ ہے کہ قدامت کی صفت قدیم کی ذات سے زائد ہے، ان خیالوں کی بے ہودگی اس سے ظاہر ہے کہ اس بنا پر بقا کی بقا اور صفات کی بقا اور قدامت کی قدامت اور صفات کی قدامت کا ضبط لازم آتا ہے۔

اَلْوَارِثُ جل جلالہ:

(فنائے موجودات کے بعد باقی رہنے والا)، وارث وہ ہے جو مالکوں کے فنا ہونے کے بعد مملوکات کا مالک قرار پاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے جو خلقت کے فنا ہو جانے کے بعد باقی ہے، اور آخر ہر شے کا مرجع وہی ہے، اس وقت وہ یوں فرمائے گا، لمن الملک الیوم: آج کس کی بادشاہی ہے، پھر خود ہی یوں جواب دے گا۔ للہ الواحد القھار: اللہ واحد قہار کی بادشاہی ہے یہ سائلانہ ندا ان اکثر لوگوں کے غلط زعم کو دور کرنے کی غرض سے کی جائے گی، جو خود بادشاہ اور صاحب ملک ہونے کا گھمنڈ رکھتے ہیں، اس وقت اصل معاملہ ان پر آئینہ ہو جائے گا، لیکن جو لوگ صاحب بصیرت ہیں، وہ ہمیشہ سے خود بخود اس ندا کے منی سمجھے ہوئے ہیں، بلکہ یہی ندا بلا حرف و آواز ہر وقت سن رہے ہیں اور دل سے یقین رکھتے ہیں کہ ہر وقت اور ہر لمحہ میں اللہ واحد قہار کی بادشاہی ہے، اور اس لیے وہ ازلی اور ابدی ہے، اس بات کو کچھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو توحید فی الفعل کی حقیقت جانتا ہے اور بخوبی سمجھتا ہے، کہ زمین و آسمان کی سلطنت میں فاعل وہی واحد و یکتا ہے۔

فاروقی

AL RAHMAN
The Compassionate

AL RAHIM – The Merciful

AL RAHIM – The Merciful

AL RAHIM
The Merciful

AL MALIK – The Sovereign

AL QUDDUS – The Holy

AS SALAM – The Source of Peace

AL MU'MIN– The Giver of Faith

Farooqi
2016

AL MUHAYMIN– The Protector

AL 'AZIZ– The Almighty

AL JABBAR – The Irresistable

AL Mutakabbir – The Superb

AL KHALIQ – The Creator

AL BARI – The Maker

AL MUSAWWIR – The Shaper

AL GHAFFAR – The Forgiving

AL QAHAR – The Dominant

AL WAHHAB – The Bestower
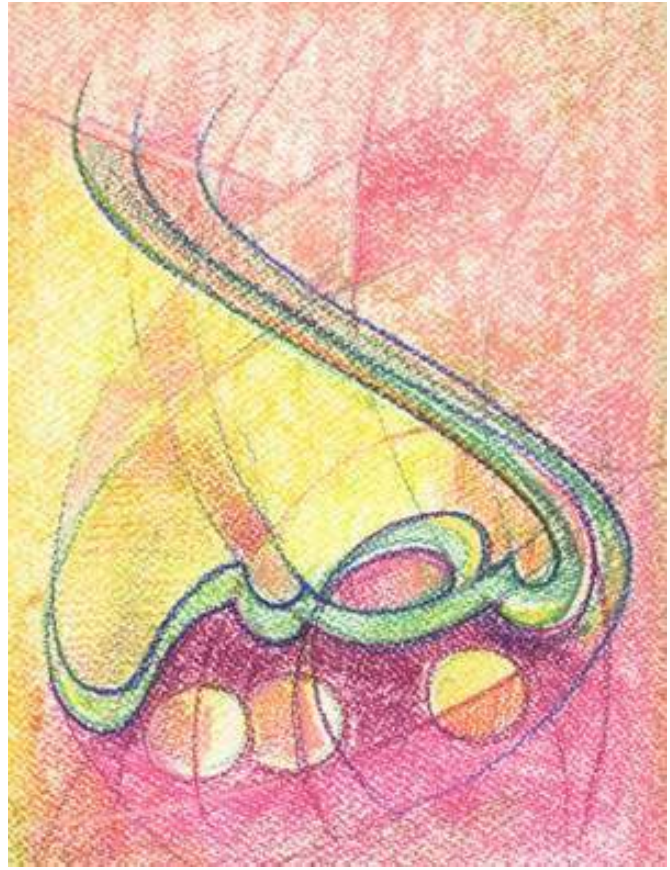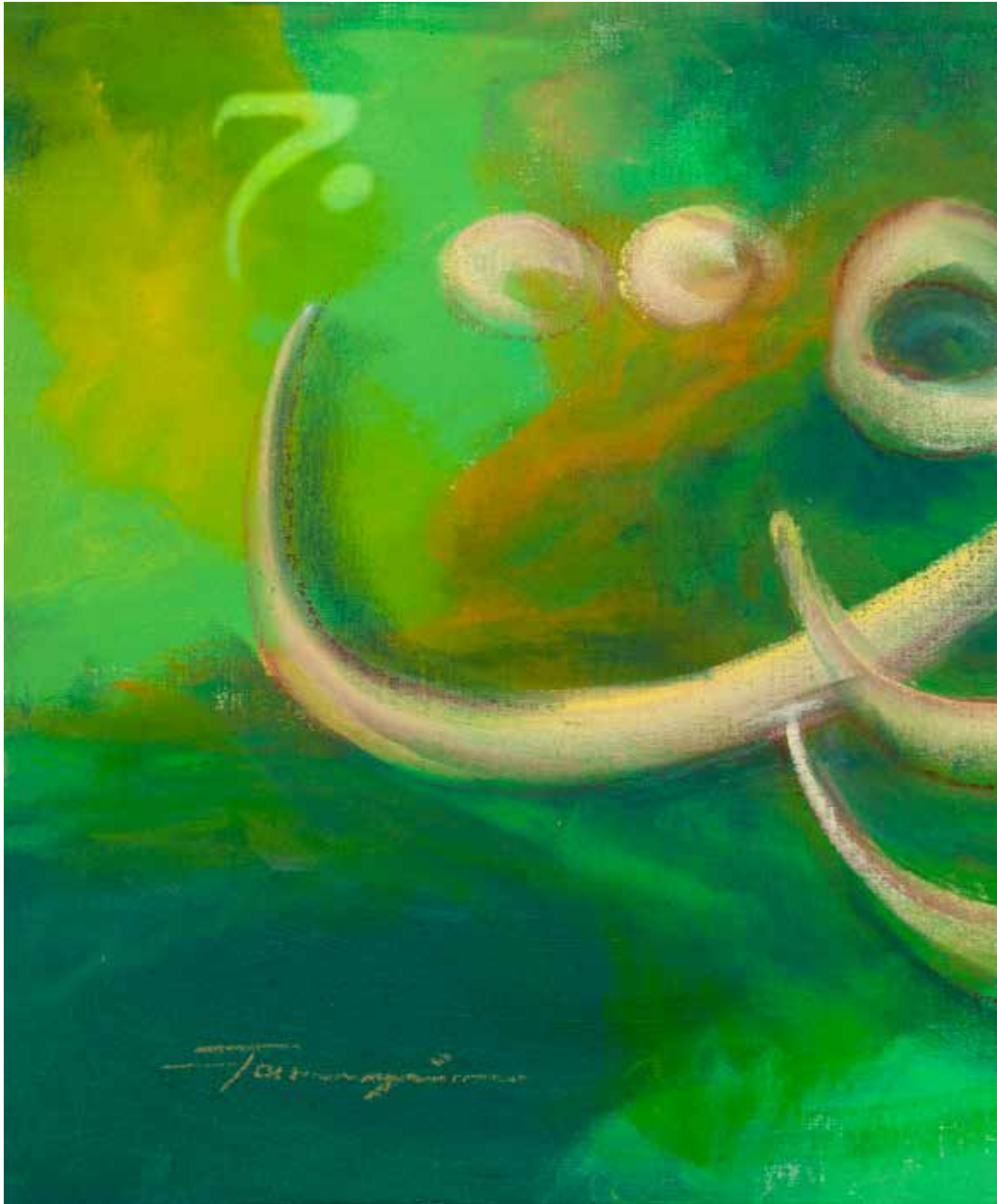
AL RAZZAQ – The Provider

AL FATTAH – The Opener

AL 'ALIM – The ALL KNOWING

AL QABIZ – The Seizer

AL BASIT – The Expander

AL KHAFID – The Abaser

AL KHAFID – The Abaser

AL RAFI' – The Exalter

AL MU'IZZ – The Honourer
AL MUDHILL – The Dishonourer

AS SAMI – The All-Hearing
AL BASIR – The All-Seeing

AL HAKAM – The Judge

AL 'ADL – The Just

AL LATIF – The Gracious

AL KHABIR – The Aware

AL HALIM – The Kindly

AL AZIM – The Great One

AL GHAFUR – The Pardoner

AS SHAKUR– The Appreciative

AL 'ALIY– The Sublime

AL 'ALIY– The Sublime

AL KABIR– The Great
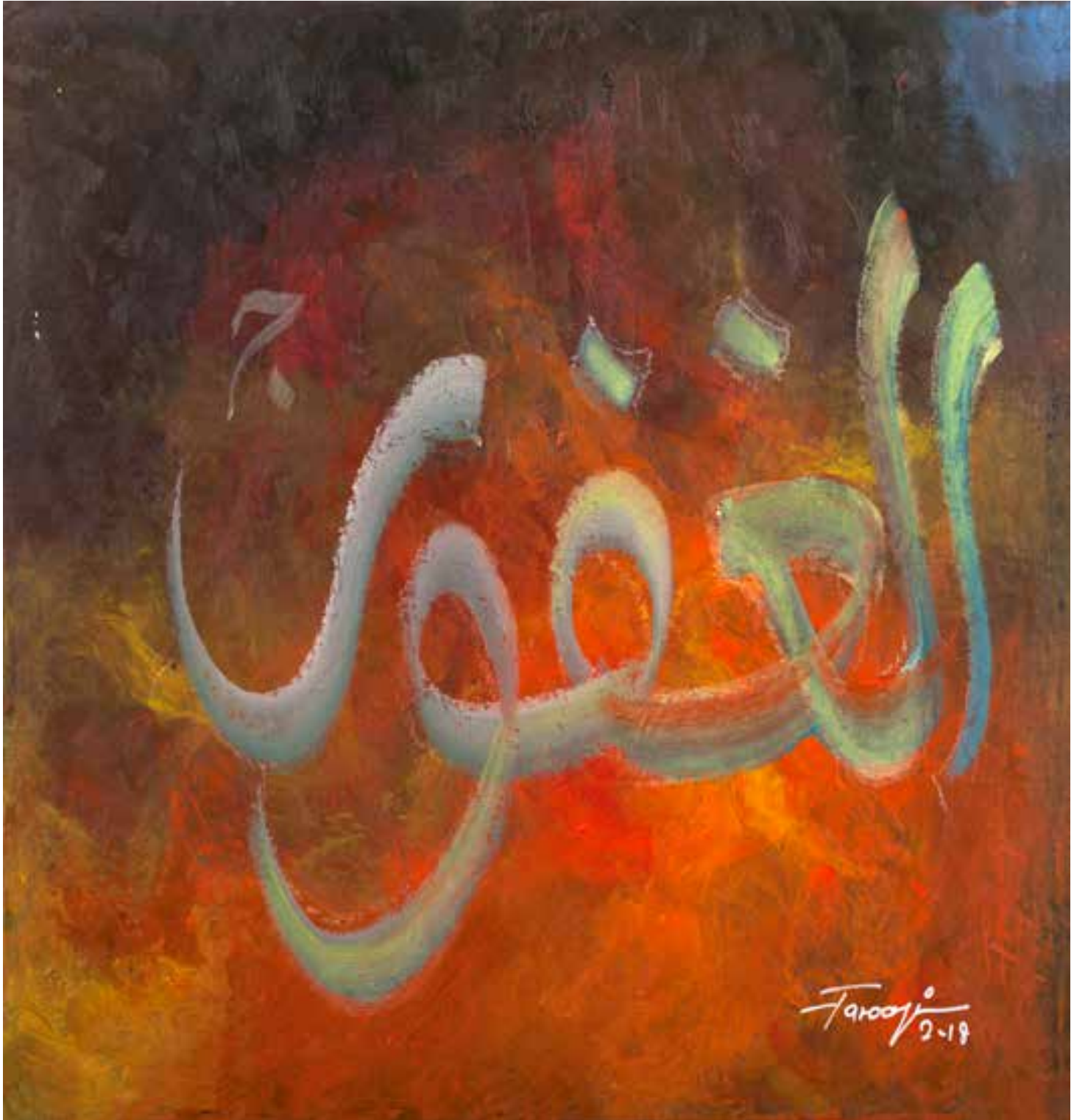
AL HAFIZ– The Guardian

AL MUQEET – The Sustaining

AL HAKIM– The Wise

AL HAKIM– The Wise

AL JALIL– The Glorious

AL KARIM– The Generous

AR RAQIB – The Watchful

AL MUJIB – The Responsive

AL MUJIB – The Responsive
AL WASI' – The All Embracing

AL HAKIM – The Wise

AL WADUD – The Loving

AL MAJID – The Glorious

AL BA'ITH – The Resurrector
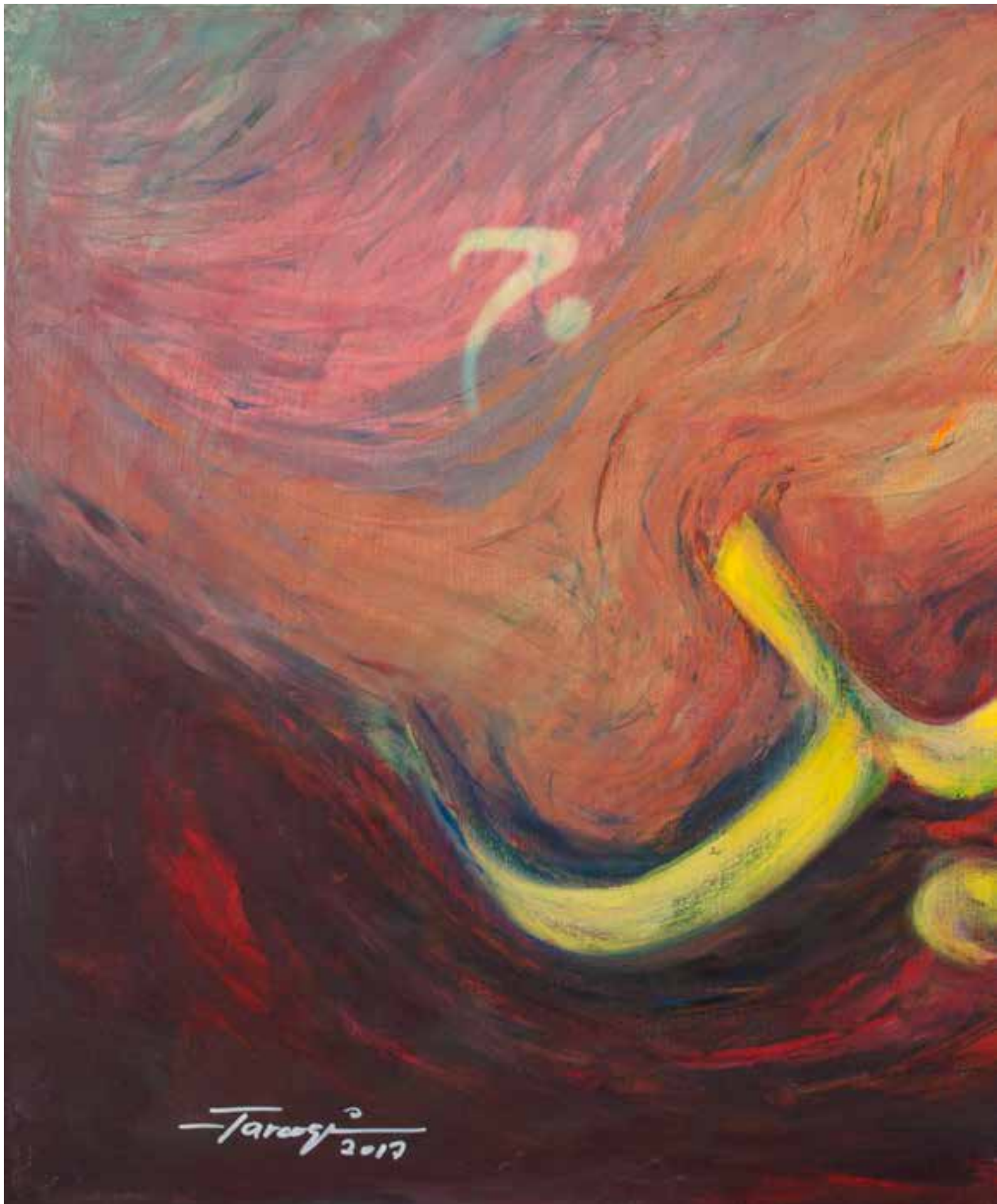
ASH SHAHID – The Witness

AL HAQQ – The Truth

AL WAKIL – The Trustee
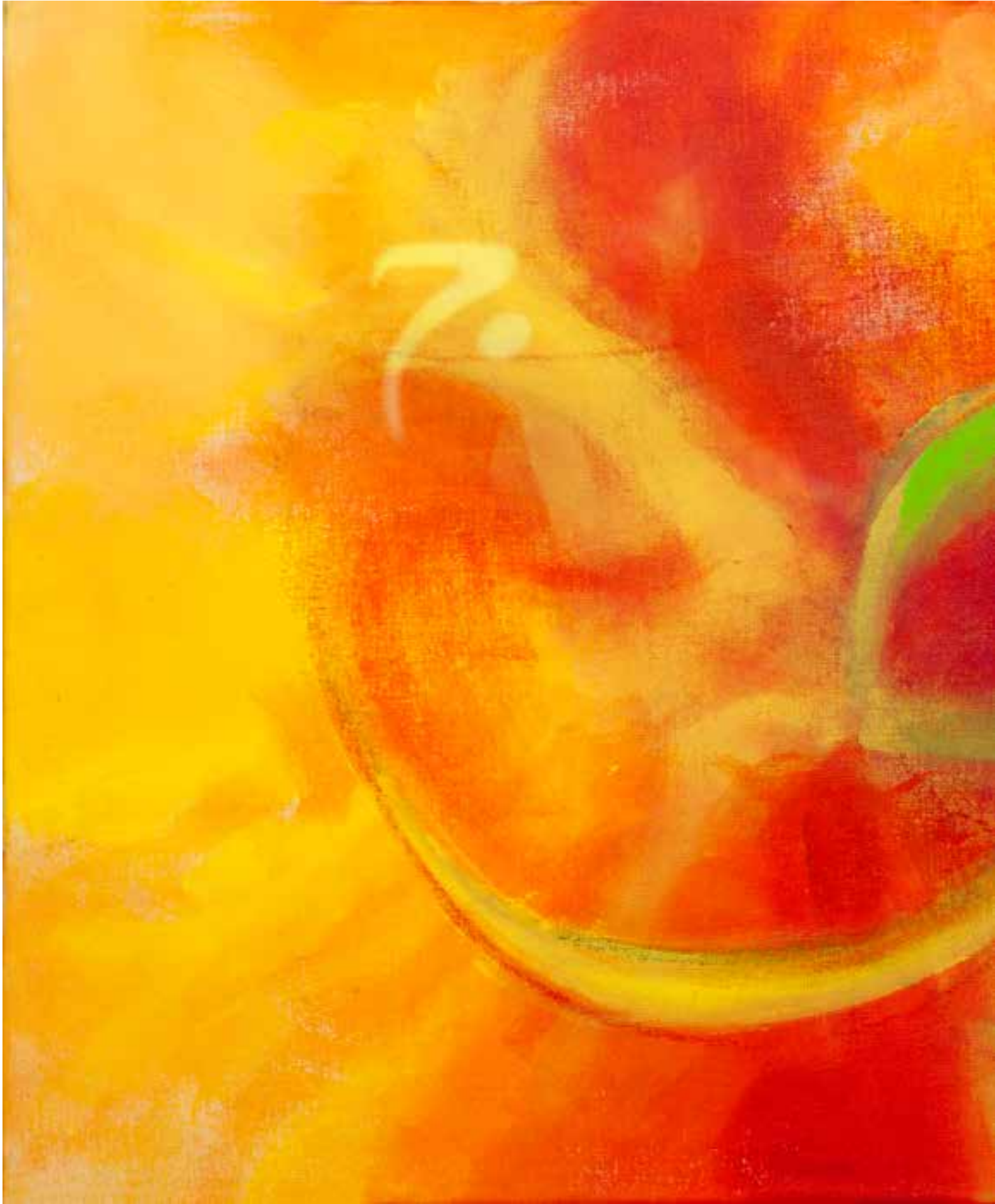
AL QAWIY – The Strong

AL MATIN – The Firm

AL MATIN – The Firm

AL WALIY – The Patron

AL HAMID – The Praiseworthy

AL MUHSI – The Counter

AL MUBDI – The Founder

AL MU'ID – The Restorer

AL MUHYI – The Giver of Life

AL MUMIT – The Giver of Death

AL HAYY – The Everliving

AL MATIN – The Firm

AL QAYYUM – The Self-Subsistent

AL WAJID – The Self-Reliant
AL MAJID – The Glorious
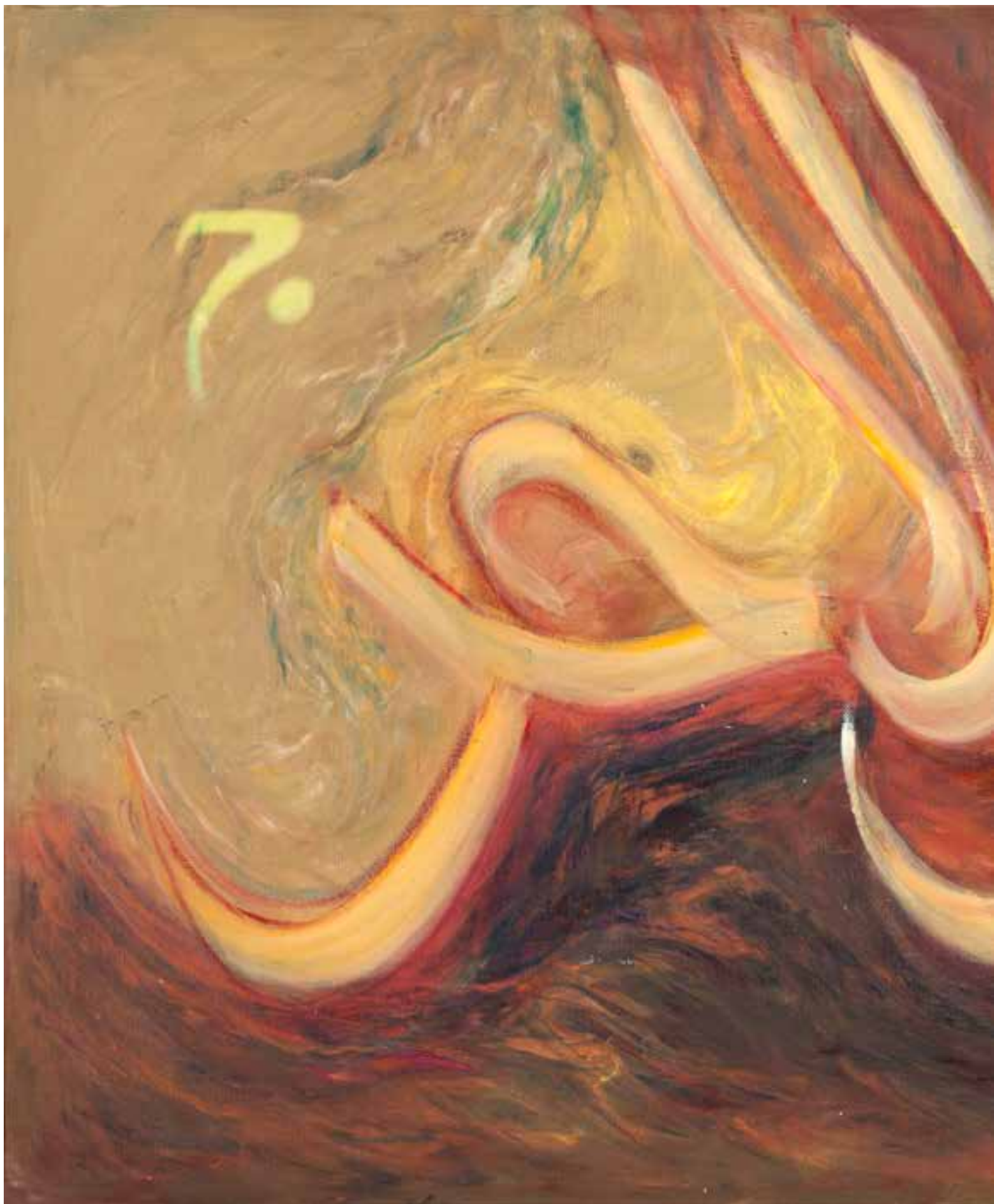
AL WAHID – The One
AL AHAD – The Only

Faroqi
2-18

AS SAMAD – The Eternal

AL QADIR – The Capable

AL MUQTADIR – The Prevailer
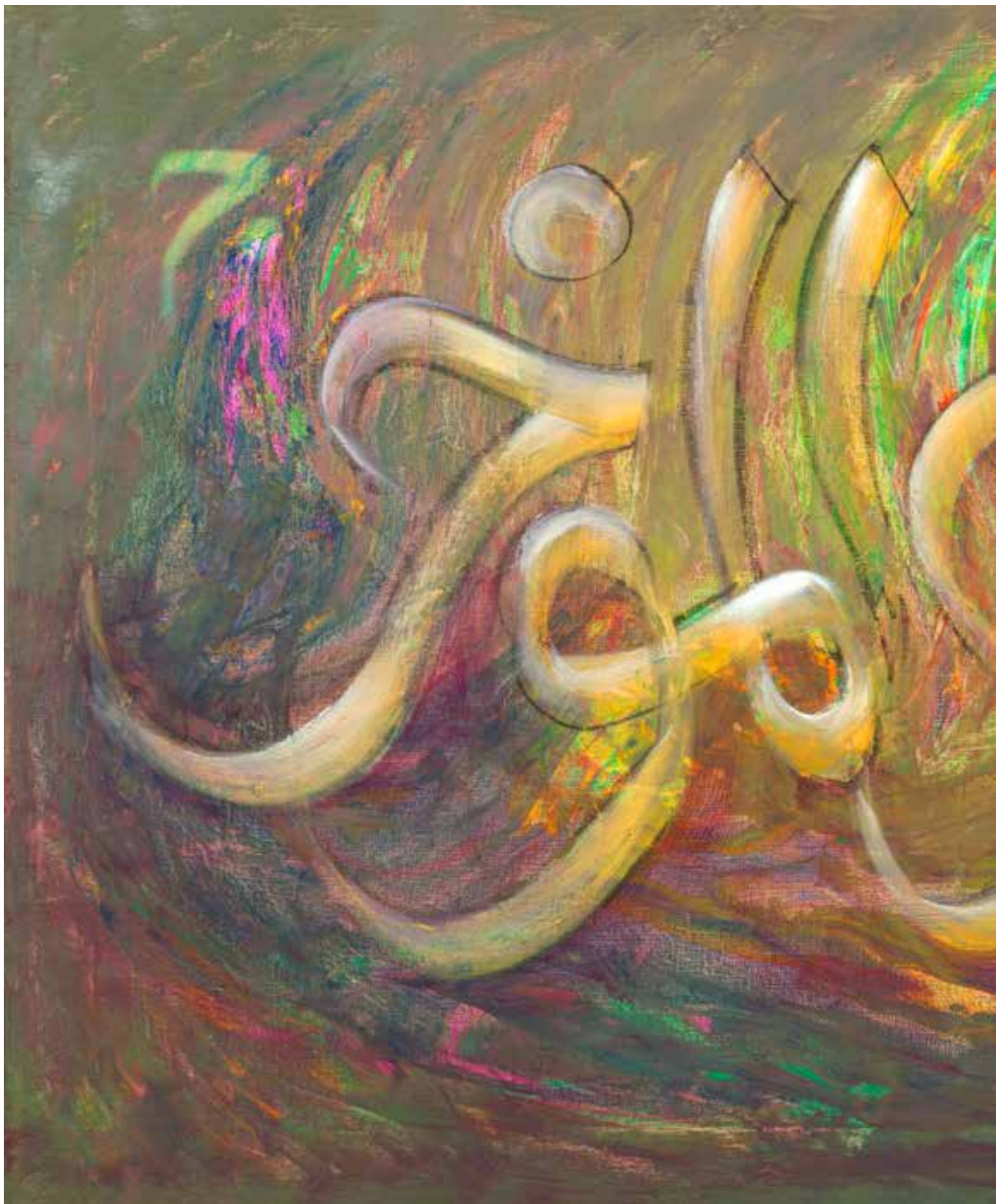
AL MUQADDIM – The Bringing Forward
AL MU'AKHKHIR – The Bringing Forward

AL AWWAL – The First
AL AKHIR – The Last

AL ZAHIR – The Evident
AL BATIN – The Inner

Farooqi
2-18

AL WALI – The Protector
AL MUTA'ALI – The Self-Exhalted

AL BARR – The Beneficial

AL TAWWAB – The Accepter of Repentance

AL MUNTAQIM – The Avenger

AL'AFUW – The Forgiving
AL RA'UF – The Gentle

MALIK'L-MULK – The Possessor of the Kingdom

DHUL'L-JALAL WA'L-IKRAM – The Lord of Majesty and Generosity

AL JAMI' – The Gatherer

AL GHANI – The Self-Sufficient

AL GHANI – The Self-Sufficient

AL MUGHNI – The Enricher
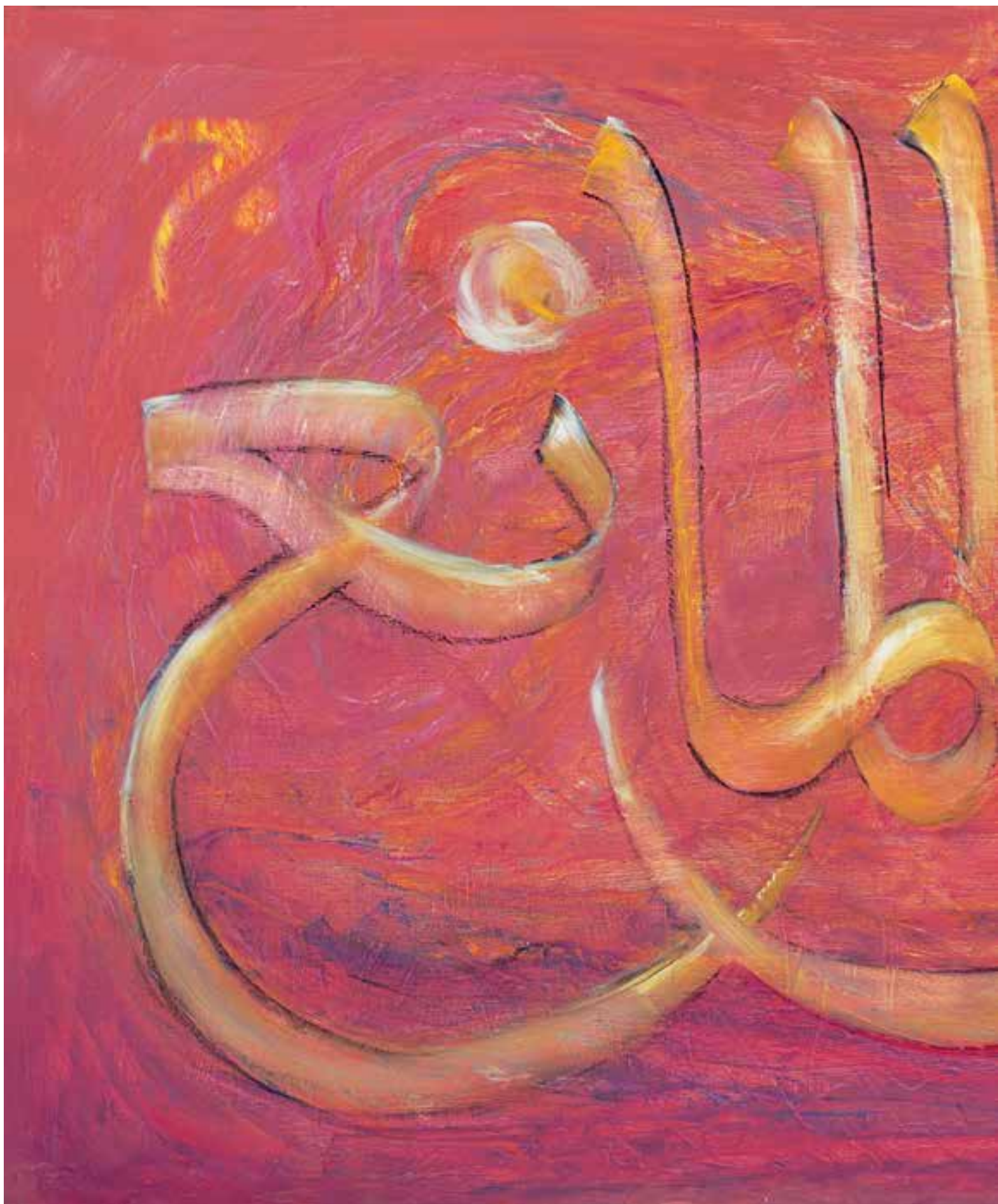
AL MUGHNI – The Enricher

AL MANI' – The Preventer

AD DAR – The Distresser
AL NAFI' – The Profiter

AN NUR – The Light

AL BAQI – The Everlasting

AL HADI – The Guide
AL BADI' – The Organiser

AL WARITH – The Inheritor
AR RASHID – The Guide
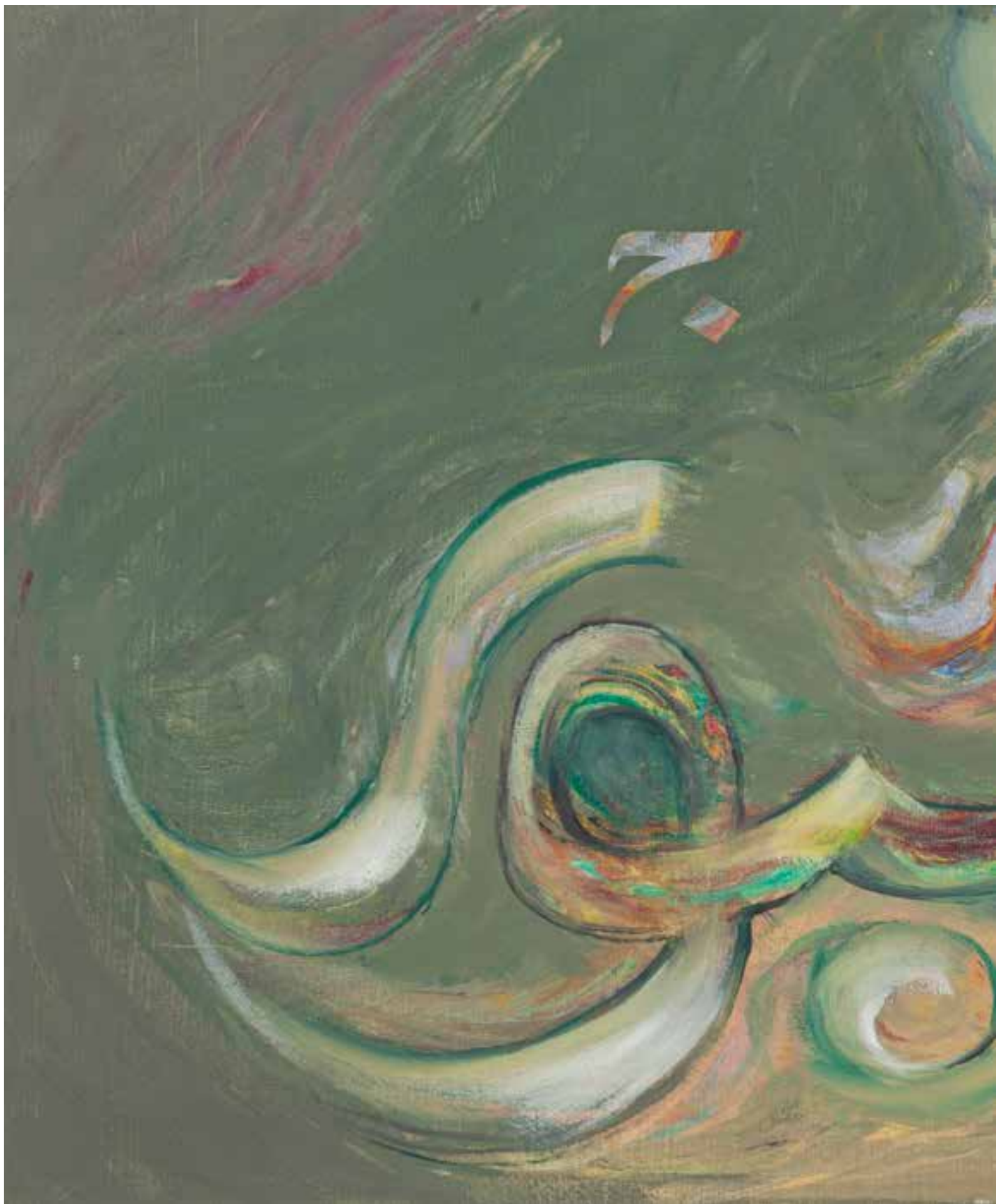
AS SABUR – The Forebearing

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روز محشر عذر ہائے من پذیر

در حسابم را تو بینی ناگزیر

از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

(اقبال)

SHAFIQUE FAROOQI

1942	Born and basic education in Sialkot, Pakistan.
1966	Diploma in Graphic Arts (PTT Lahore, Pakistan).
1968	Certificate in Drawing and Paintings (NCA, Lahore, Pakistan).
1997	Master in Fine Arts (Istanbul Technical University, Turkey).

SHORT COURSES/WORKSHOPS

1960	Munshi Muhammad Hussain, Calligrapher, Lahore.
1962	Muhammad Ashraf, Artist, Lahore at his studio.
1965	Ustad Allah Buksh, in his studio.
1965	Ustad Rafique Qureshi, Art Editor in Kohistan News Paper.
1965-68	Attended Art Classes at Alhamra Art Academy, Lahore, Pakistan.
1982	Prof. Anna Molka Ahmed, Lahore, Pakistan.
1985	Artist Harry L. Johnson, Washington DC, USA.
1990	Etching Printmaking Workshop, Memar Senan University, Istanbul.
1991	Prof. Namik Denizhan, (Sculpture), Istanbul.
1994	On Job Training as Project Director on Vocational Education for Disable Persons, by SWOZ, Holland.
1998	Tyfur Sanliman Huca on Spiritual Art, Istanbul.

STUDY VISITS ABROAD

1. The Holy Cities of Mecca and Medina.
2. The National Art Museum, Bonn, Germany.
3. The National Art Museum, Cologne, Germany.
4. The Top Kapi Palace, National Art Museum, Press Museum, Istanbul, Turkey
5. The Dolmabahce Saray and Chiraghan Saray Museum, Istanbul, Turkey.
6. The National Art Museum, Ankara, Turkey.
7. The Historical Places in Kapa Docia,Turkey.
8. The National Museum of Heritage, Sharjah, UAE.
9. The National Art Museum and Old Pyramids in Cairo, Egypt.
10. The Petra (Archaic Ruins), Jordan.
11. The National Art Museum and Smithsonian Institution, Washington, USA.
12. The Tate Art Gallery and National Art Museum, London, UK.
13. The National Art Museum, Rembrandt Art Museum and Madame Tussauds Museum in Amsterdam, Holland.
14. The National Art Museum, Rotterdam, Holland.
15. The Lalit Kala Academi, Dehli, India.

ART PUBLICATIONS

1. Darakhat Dervish (Coffee Table Book)
2. The Tale of Drunken Flute in Whirling Dervishes (Coffee Table Book)
3. Symbiosis Concept in Art (Journey of Lines).
4. Poetery of Lines.
5. Journey of Lines with Symbols.
6. Journey of Lines with Calligraphy.
7. Journey of Lines with Colours.
8. Chenda Zaman (Turkish Poetry).
9. Start with the name of Allah.

MENTIONABLE ART WORK AND COLLECTORS

• Sheikh Zayed Hospital, Lahore.	80 Paintings
• Civil Hospital, Lahore.	5 Paintings
• World Bank, IMF Building, USA.	4 Paintings
• Tam International, USA.	2 Paintings
• Smithsonian Institute, USA.	2 Paintings
• Princes Wijdan of Jordan.	1 Painting
• Research Center for Islamic Art and Culture, Istanbul.	2 Paintings
• Press Museum, Istanbul.	2 Paintings

• Consulate General of Pakistan, Istanbul.	2 Paintings
• Beyoglu Belediye, Istanbul.	2 Paintings
• Bursa Metropolitan Corporation, Turkey.	6 Paintings
• Pearl-Continental Hotel, Lahore.	10 Paintings
• Fatima Memorial Hospital, Lahore.	50 Paintings
• Ittefaq Hospital, Lahore.	20 Paintings
• Pakistan Administrative Staff College, Lahore.	5 Paintings
• Arab Security Center, Riyadh, Saudi Arabia.	20 Paintings
• Directorate General, Civil Defense, Islamabad.	4 Paintings
• Institute of Business Administration, Karachi.	1 Painting
• PN Staff College, Karachi.	1 Painting
• Lahore Museum.	1 Painting
• Ministry of Foreign Affair, Islamabad.	20 Paintings
• Fountain House, Lahore.	6 Paintings
• Lahore Metropolitan Corporation.	10 Paintings
• Lok-Virsa Museum, Islamabad.	1 Painting
• Several private collectors in Pakistan and abroad.	More than 2000
• 101 Solo Shows in country and abroad.	

Participated more than hundred group exhibition in USA, England, Saudi Arabia, Germany, Egypt, Sudan, France, Canada, Holland, Turkey, India, UAE, Behrain, Masqat, Iran,' Iraq, and National Exhibitions in Pakistan.

HONORS

1960-61	Vice President, Student Welfare Society, Sialkot.
1962-65	General Secrectary, WPYM, Sialkot.
1965-67	President "Shaheen" of WPYM, Lahore.
1967-68	Assistant Secretary General WPYM, Lahore.
1972	Joint Secretary, Punjab Art Society, Lahore.
1982-83	Member, Art Committee, Lahore Art Council, Lahore.
1983	Member, Calligraphist Association of Tehran, Iran.
1984-85	Chairman, Art Committee, Academy for Disabled, Lahore Pakistan.
1986-87	Member, Executive Committee, Artists Association of Punjab.
1990	Member, Art Committee Lahore Art. Council.
1990	Vice President Calligraphist Guild of Pakistan, Lahore.
1993	Pattern, Society for the Advancement of Mentally Retarded (SAMR), Lahore.
1998	Secretary General, Pakistan Calligraphic Artist Guild.
1998	Chairman, Family Support Program, Pakistan.

JOBS EXPERIENCE

1965-75	Graphic Artist, IER, Punjab University, Lahore, Pakistan.
1971-72	Audio Visual Aids Officer, NIPA, Lahore, Pakistan.
1975-80	Audio Visual Aids Officer, Pakistan Administrative Staff College, Lahore.
1980-82	Audio Visual Aids and Publications Officer, Civil Services Academy, Lahore, Pakistan.
1982-90	Advisor for Vocational Training, Fountain House, Lahore, Pakistan.
1991-99	Project Director, Family Support Program for Special Children, Istanbul.
2001-04	Faculty Member of Ajman University of Science and Technology, Interior Design Department (UAE).
2005	Established a Studio, as Dervish Gah/ Farooqi Art Studio in Siddiq Trade Center, Lahore, Pakistan.

STATEMENT OF ARTIST

My paintings are formed out of my impressions, observations and my emotional experiences, I see reality as an endless process of conflicts and decisions, therefore the totality of experience can never be resolved in a definite way. The texture of life is like the surface of a block of clay; it is shaped and molded by the circumstances of daily conflicts, personal and collective catastrophes and individual questioning. My work lives on this quest until it becomes a rite of realizations, a struggle for the possibility to order the sensation of consciousness.

STUDIO AND DISPLAY

Farooqi Art Studio/ Dervishgah
M8, Siddiq Trade Center, Main Gulberg, Lahore, Pakistan.
Contact: +92 306 401 6514
email: sfarooqiart@yahoo.com,
farooqiart@gmail.com
www.shafiquefarooqi.com

MR. UMER FAROOQ FAROOQI

Office No. 202, Azeem Mansion, Fazal-e-Haq Road, Blue Area,
Islamabad.
Contact: +92 300 503 6836
email: umer.faruqi@gmail.com